خبرنامہ

ماہنامہ اُترپردیش اُردو اکادمی لکھنؤ

دسمبر ۲۰۲۴ء

اترپردیش اردو اکادمی
उत्तर प्रदेश उर्दू अकादमी

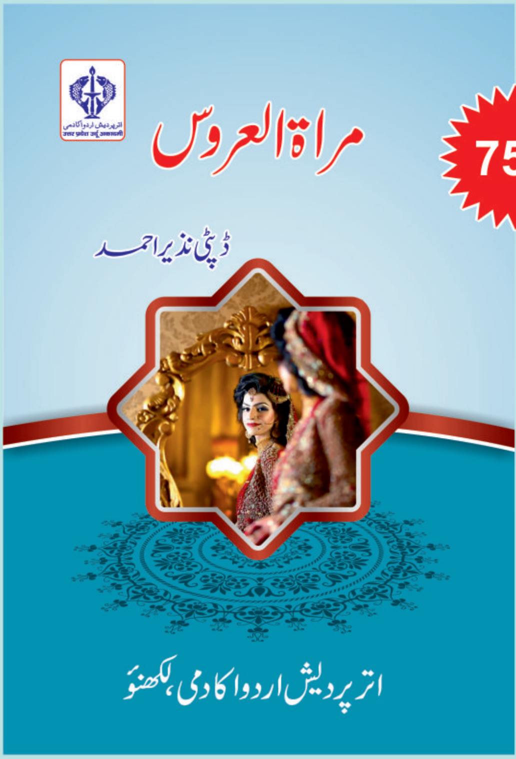

مراۃ العروس
ڈپٹی نذیر احمد
اترپردیش اردو اکادمی، لکھنؤ

75/-

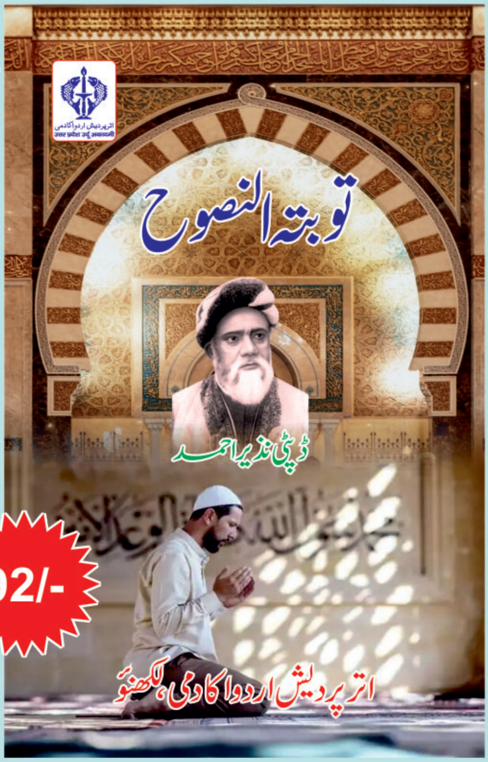

توبۃ النصوح
ڈپٹی نذیر احمد
اترپردیش اردو اکادمی، لکھنؤ

92/-

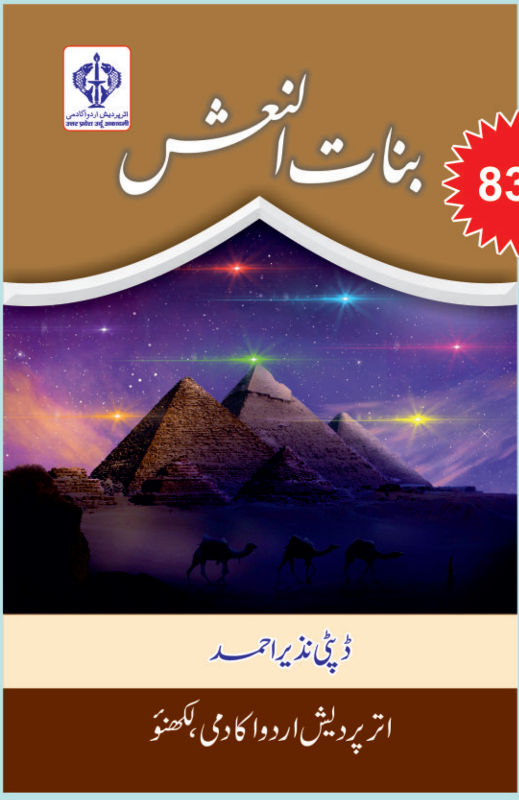

بنات النعش
ڈپٹی نذیر احمد
اترپردیش اردو اکادمی، لکھنؤ

83/-

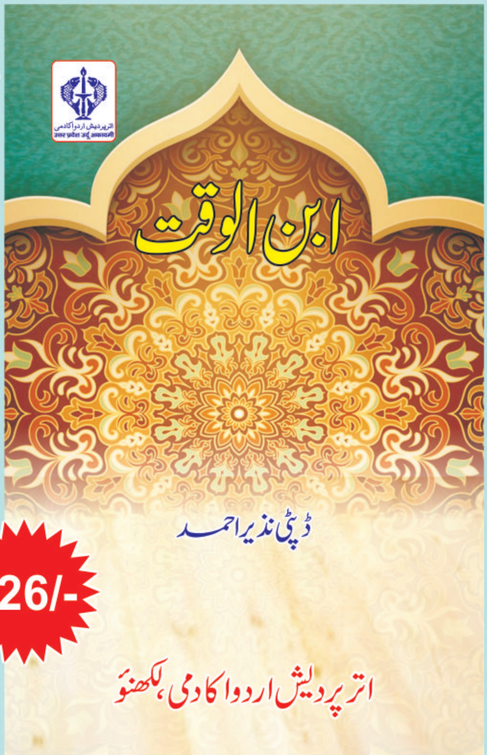

ابن الوقت
ڈپٹی نذیر احمد
اترپردیش اردو اکادمی، لکھنؤ

126/-

اترپردیش اردو اکادمی

خبـــرنامہ

دسمبر۲۰۲۴ء

جلد : ۵۳ شمارہ : ۶

ایڈیٹر : شوکت علی (سکریٹری)

معاون : ممتاز احمد (سپرنٹنڈنٹ)

زرِ سالانہ : پچاس روپے-/50

قیمت فی شمارہ : پانچ روپے-/5

upurduakademi3@gmail.com

www.upurduakademi.in

خط وکتابت وترسیل زر کا پتہ

سکریٹری، اترپردیش اردو اکادمی، وبھوتی کھنڈ

گومتی نگر، لکھنؤ-226010

فون نمبر 0522-4022924

شوکت علی، سکریٹری، ایڈیٹر، پرنٹر اور پبلشر نے امپریشن پرنٹ ہاؤس، لاٹوش روڈ، لکھنؤ سے چھپوا کر دفتر اردو اکادمی، وبھوتی کھنڈ، گومتی نگر، لکھنؤ سے شائع کیا۔

ترتیب

اداریہ — ایڈیٹر — ۰۲

اترپردیش میں

اردو زبان وادب کا ارتقاء — مریم جمیلہ — ۰۳

غزل — صفی انوریانی — ۰۷

''نقش محبت''

عشق نبیؐ کا ترجمان — جاوید ساحل — ۰۸

غزل — فرزانہ پروین — ۱۰

محنت کش طبقے کا نمائندہ شاعر:

ساحر لدھیانوی — شبانہ عشرت — ۱۱

حسن سلوک — ڈاکٹر مہ ناز انور — ۱۶

غزل — ڈاکٹر زرینہ بیگم زریں — ۱۹

غزل — عامر عطا — ۱۹

زبان کی توسیع کے ذرائع — ڈاکٹر سعید سندیلوی — ۲۰

غزل — فوزیہ اختر ازکیٰ — ۲۳

غزل — رضوان احمد فاروقی — ۲۳

انسانیت (افسانہ) — ڈاکٹر عبدالغفار فاروقی — ۲۴

غزل — طلحہ تابش — ۲۸

علامہ عبدالعزیز رحیم آبادی:

حیات وخدمات — مبصر: ذکی نور عظیم — ۲۹

علمی وادبی خبریں — ادارہ — ۳۱

قارئین کے خطوط — ۳۲

اداریہ

اتر پردیش اردو اکادمی مسلسل اردو زبان وادب کی ترقی وترویج کے لئے کوشاں رہتی ہے۔اکادمی کے اغراض ومقاصد پورا کرنے کی غرض سے ہی مختلف اسکیمیں اور پروگرام چلائے جاتے ہیں۔اکادمی میں مختلف رجسٹرڈ تنظیموں کو زبان وادب کے فروغ کی خاطر سیمینار کرانے کے لئے مالی امداد بھی دی جاتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ مختلف اردو تنظیموں کی جانب سے اہم اور بحث طلب موضوعات پر برابر سیمینار منعقد کئے جاتے ہیں،مشاعرے وڈرامے بھی منعقد کئے جاتے ہیں۔اس طرح کے پروگراموں کے ساتھ ساتھ ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو زبان وادب کے تحفظ کی جانب مزید سنجیدہ اقدامات کئے جائیں۔جن گھروں میں اردو کا بول بالا تھا آج ان گھروں سے اردو رخصت ہو رہی ہے۔عام لوگوں کو اردو زبان سے کیسے جوڑا جائے،اس کے لئے کیا طریقے اختیار کئے جائیں اس پر بحث ہونی چاہئے۔اگر محاسبہ کیا جائے تو یہ بات سامنے آئے گی کہ آخر لوگ اردو سے دور کیوں ہو رہے ہیں۔اور یہ بحث اور غور وفکر مثبت ہونی چاہئے تا کہ اس کے نتیجہ میں ہم ایسا لائحہ عمل طے کر سکیں جس سے اردو کا کارواں آگے بڑھ سکے۔

جن لوگوں کو اردو کی شیرینی اور اس کی نفاست ونزاکت سے لگاؤ ہے وہ اردو کی جانب دلچسپی لے رہے ہیں۔کاش اردو سے وابستہ اساتذہ اور اردو تنظیمیں اپنی ذمہ داریوں کو عملی جامہ پہنانے کا کام مزید اچھے ڈھنگ سے کریں تا کہ اردو زبان وادب کو اس کا پرانا وقار حاصل ہو جائے۔

اردو رسائل شائع ضرور ہوتے ہیں مگر خریداروں کی تعداد کم ہوتی جا رہی ہے،اسی طرح اردو کتابیں شائع تو ہو رہی ہیں مگر ان کو خریدنے والوں کی تعداد بھی کم ہوتی جا رہی ہے۔اس لئے ضروری ہے کہ ہم اپنے گھروں میں اردو کا ماحول بنائیں،اردو رسائل اور اردو اخبارات ضرور رکھیں،بچوں سے متعلق اردو رسائل اور کتابیں بھی ضرور رکھیں۔اردو کتب ورسائل کی خریداری اردو کی عملی خدمت کی جانب بڑا قدم ہے۔والدین دوسری زبانوں کے ساتھ ساتھ اپنی زبان وتہذیب کو بچانے کے لئے بچوں کو متوجہ کریں،انھیں اردو کی تعلیم دیں اور گھر میں اپنی مادری زبان میں ہی گفتگو کریں۔امید ہے کہ قارئین اردو زبان کو اس کا وقار دلانے کے لئے ضرور آگے آئیں گے اور عملی طور پر اس کا ثبوت بھی دیں گے۔

سال ۲۰۲۴ء رخصت ہو رہا ہے۔اس دوران ہم نے کیا حاصل کیا اور کیا کھودیا اس کا محاسبہ ہمیں چاہئے۔اس برس بھی اردو کی اچھی کتابیں اور معیاری رسائل شائع ہوئے ہمیں یہ سوچنا چاہئے کہ ہم نے اردو کتابوں ورسائل کی خریداری پر کتنا خرچ کیا۔سال ۲۰۲۴ء میں بہت سے ادباء،شعراء،محققین،ناقدین وصحافی ہم سے جدا ہو گئے ادارہ 'خبر نامہ' ان سب کو بھرپور خراج عقیدت پیش کرتا ہے۔

شوکت علی

ایڈیٹر

مریم جمیلہ

ریسرچ اسکالر یونیورسٹی آف حیدرآباد

اتر پردیش میں اردو زبان وادب کا ارتقاء

اردو زبان ہندوستان میں پیدا ہوئی اور یہیں پر ترقی کے منازل کو بھی طے کیا۔ یہ واحد ایسی زبان ہے جو سب سے زیادہ اس ملک میں بولی جاتی ہے اور جہاں پورے طور سے نہیں بولی جاتی پھر بھی وہاں اس کے الفاظ بگڑی ہوئی شکل میں استعمال ہوتے ہیں۔ جب ان بگڑے ہوئے الفاظ کا ماٰخذ تلاش کرتے ہیں تو وہ اردو زبان ہی میں ملتے ہیں۔ اتر پردیش ہندوستان کا وہ واحد صوبہ ہے جہاں اردو زبان اور اس کے الفاظ کثرت سے بولے جاتے ہیں۔ اتر پردیش کے رامپور، مرادآباد، سنبھل، امروہہ، بجنور، مظفر نگر، لکھنو، مئو، فیض آباد، گورکھپور، بستی، جونپور، سنبھل، الہٰ آباد، سیتاپور اور اعظم گڑھ وغیرہ اردو کے اہم مراکز ہیں۔ جہاں اردو زبان اپنی شکل میں یا بگڑے ہوئے الفاظ میں بولی جاتی ہے۔

اتر پردیش میں اردو کی شروعات:

اردو زبان ہند اسلامی تہذیب کا بہترین ثمر ہے۔ مسلمان فاتحین برصغیر میں آئے تو اپنے ساتھ عربی، فارسی اور ترکی زبانیں بھی لائے اس وقت برصغیر میں خاص وعام کی زبان سنسکرت عوام سے ناطہ توڑ چکی تھی لیکن مقامی طور پر ایسی بہت سی بولیاں رائج تھیں جنھیں اس علاقہ کے لوگ استعمال کرتے تھے۔ مسلمانوں نے انہیں نہ صرف قبول کیا بلکہ سہارا بھی دیا اور نئے ذخیرہ الفاظ کی فطری شمولیت سے جدید دور کی ایک اہم زبان اردو وضع ہوگئی۔ اردو زبان کے رشتے اگر چہ برصغیر ہند کی قدیم مقامی بولیوں کے ساتھ وابستہ ہیں لیکن اسے باوقار ادبی زبان بنانے میں یہاں کے مسلمانوں نے اہم کردار ادا کیا۔ اس زبان نے ابتدائی دور میں مسلمانوں کے ساتھ شمال یعنی لکھنؤ، رامپور، آگرہ اور دلّی سے جنوب کی جانب سفر کیا اور گجرات، دکن اور حیدرآباد تک پہنچ گئی پھر ولی کی زبان میں اس زبان کی واپسی کا سفر شروع ہوا تو دلّی، آگرہ، رامپور، فیض آباد اور لکھنؤ اس کے اہم مراکز بنے۔ اورنگزیب کی وفات کے بعد مغلوں کے داخلی انتشار نے پورے ملک کو زوال آمادہ کردیا۔ پلاسی اور بکسر کی جنگ کے بعد انگریزوں نے بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی حاصل کرلی اور شاہ عالم بادشاہ فاتحین کا حریف بن کر رہ گیا۔ ۱۷۸۴ء میں ایسٹ انڈیا ایکٹ کی منظوری سے ہندوستان میں انگریزوں کی حکمرانی کا دور شروع ہوگیا۔ اس زمانے میں آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر پیدا ہوئے۔ ہندوستان میں لارڈ کارنوالس گورنر جنرل تھا جس سے ایک نئے سیاسی دور کا آغاز ہوا۔ اس دوران شیخ عبدالاحد سرہندی، سعداللہ گلشن اور مرزا مظہر جان جاناں نے اردو علم وادب میں نام پیدا

کیا۔ولی دکنی نے فارسی مضامین کو اردو قالب میں پیش کرنے کا سلسلہ شروع کیا۔درد، یقین اور تاباں جیسے شعراء پیدا ہوئے اور جدید اردو کی بنیاد رکھی گئی۔انیسویں صدی کے شروع میں مسلمان سیاسی طور پر زوال پذیر ہو چکے تھے،حکومت پر انگریزوں کا قبضہ تھا،مغل بادشاہ کی کوئی حیثیت نہ تھی۔سید احمد کی تحریک ۱۸۳۱ء میں دم توڑ چکی تھی اور اودھ کا الحاق ۱۸۵۶ء میں مکمل کر لیا گیا تھا۔(۱)

دلّی کی بربادی سے لے کر ۱۹۴۷ء تک کا دور انگریزوں کی مکمل حکمرانی اور آزادی کی نئی تحریکوں کا دور تھا۔اس دور میں سرسید احمد خان، علامہ اقبال اور محمد علی جناح جیسی شخصیات پیدا ہوئیں، جنھوں نے شجرِ قومیت کی آبیاری کی۔اردو زبان کی ابتداء کے بارے میں سرسید احمد کا خیال ہے کہ اردو کا ہیولیٰ خلجی سلاطین کے عہد میں تیار ہو گیا تھا لیکن اس ہیولے نے زبان کی شکل عہد شاہجہاں میں اختیار کی۔ڈاکٹر وہائٹ برجنٹ کے مطابق اردو زبان کی ابتداء شہنشاہ اکبر کے ہاتھ سے ہوئی۔آگرہ اور دلّی کے درمیانی اضلاع کی زبان مغربی ہندی کی ایک شاخ تھی جس کو برج بھاشا کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا جو موجودہ وقت میں اردو کے نام سے جانی جاتی ہے۔(۲)

اتر پردیش میں اردو شاعری:

دلّی میں ولی کے دیوان کی آمد سے اردو شاعری میں ایک نیا چشمہ پھوٹ نکلا تھا۔مشاعروں اور ادبی محفلوں میں بعض فارسی شعراء نے ریختہ گو شاعروں کو مذاق بنانا شروع کر دیا اور یہ اردو زبان وادب کے لئے بہت مفید ثابت ہوا۔خان آرزو نے جو پہلے فارسی کے مربی ومعاون تھے ریختہ کے مشاعرے کرانا شروع کر دیئے۔اس دور کا مجدد خان آرزو کو قرار دیا گیا۔

سراج الدین علی خاں آرزو متوفی ۱۷۵۶ء کا وطن اکبرآباد تھا۔محمد شاہ تخت نشین ہوا تو وہ دلّی گئے جب حالات بگڑے تو خان آرزو لکھنؤ چلے آئے اور وہیں وفات پائی۔ان کے شاگردوں میں میر تقی میر، آبرو، یک رنگ، مضمون اور مخلص جیسے شعراء ہیں۔ان کی شاعری کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

داغ چھوٹا نہیں یہ کس کا لہو ہے قاتل
ہاتھ بھی دکھ گئے دامن تیرا دھوتے دھوتے

عبث دل بے کسی پر اپنی تو ہر وقت روتا ہے
نہ کر غم اے دیوانے عشق میں ایسا ہی ہوتا ہے

(۳)

اٹھارویں صدی میں مغلیہ سلطنت کے بڑے بڑے صوبے خودمختار ہو گئے۔ان صوبوں میں اہم ترین اودھ (اتر پردیش) تھا۔سعادت علی خان برہان الملک اور ابوالمنصور خاں صفدر جنگ کی وفات کے بعد آصف الدّولہ نے اودھ کا دارالخلافہ فیض آباد سے لکھنؤ منتقل کیا، جس سے لکھنؤ کے سامنے دلّی کی روشنیاں بھی مات پڑ گئیں۔اس دور میں جو ارباب ادب دلّی کو خیرباد کہہ کر لکھنؤ آئے ان میں خان آرزو، جعفر علی حسرت۔میر ضاحک، منت، فغاں، سودا، میر، سوز، مصحفی، انشاء، جرأت اور میر حسن وغیرہ بے حد اہم ہیں۔اٹھارہویں صدی کے ربع آخر میں جب لکھنو کو تہذیبی ،ثقافتی اور ادبی دبستان کی حیثیت حاصل ہوگئی تو دلّی کے ٹوٹے ہوئے ستارے یہاں کے آفتاب بن گئے۔مشرق کی اس نئی تہذیبی شمع کو آصف الدولہ کے عہد میں روشنی ملنی شروع ہوئی۔نواب سعادت علی خاں، غازی الدین حیدر،نصیر الدین حیدر، محمد علی شاہ، امجد علی شاہ اور واجد علی شاہ ۱۸۴۷ءتا ۱۸۵۷ء کے عہد تک یہ اجالا کم ہوتا رہا اور واجد علی شاہ کی معزولی کے ساتھ ۱۸۵۶ء میں اس وقت بجھ گیا جب اودھ کو مملکت برطانیہ کے ساتھ ملحق کر دیا گیا۔اس دور کے لکھنؤ میں نئے مزاج کو فروغ ملا۔مرثیہ، مثنوی اور ریختی جداگانہ زاویے پر پروان چڑھے۔ڈرامے کی صنف کی

باقاعدہ ابتداء ہوئی اور شاعری جو دلّی میں فروغ فکر وخیال کا وسیلہ تھی لکھنؤ میں نزاکت اظہار کا نمونہ بن گئی اور شاہان اودھ کی سخن پروری سے لکھنؤ ایک دبستان کی حیثیت اختیار کر گیا(۴)

اتر پردیش کے چند اہم شعراء:

شرف الدین مضمونؔ،، میر سوز، اشرف علی خاں فغاںؔ، مرزا رفیع محمد سوداؔ، میر تقی میر، شیخ یحییٰ امان قلندر بخش جرأتؔ، شیخ غلام ہمدانی مصحفیؔ، انشاء اللہ خان انشاؔ، شیخ امام بخش ناسخؔ، خواجہ حیدر علی آتشؔ، سعادت یار خان رنگینؔ، شیخ بقاء اللہ بقاؔ، مرزا علی نقی محشرؔ، حیدر علی حیران، مرزا جعفر علی حسرتؔ، نواب سید محمد علی رندؔ، وزیر علی صباؔ، مظفر علی اسیرؔ، امداد علی بحرؔ، محمد رضا برقؔ، منیرؔ شکوہ آبادی، حاتم علی بیگ مہر، نواب آصف الدولہ، نواب وزیر علی وزیر، نصیر الدین حیدر بادشاہ، اختر واجد علی شاہ، جرأتؔ، اثرؔ لکھنوی، نواب مرزا جعفر علی خاں، عزیزؔ لکھنوی، پروفیسر سید احتشام حسین، سید مسعود حسن رضوی ادیب، مولانا عبدالباری آسی، مرزا ذاکر حسین، ثاقبؔ لکھنوی، مولانا فضل الحسن حسرتؔ موہانی، سید محمد حسن سالکؔ لکھنوی، سید سجاد ظہیر، سراج الحسن سراجؔ لکھنوی، محمد عمر، شوکتؔ تھانوی، مولانا سید علی نقی صفیؔ لکھنوی، سید مقبول حسین ظریفؔ، مرزا محمد ہادی عزیزؔ لکھنوی، اسرار الحق مجازؔ ردولوی، سید جعفر حسین منظرؔ لکھنوی، نیاز محمد خاں نیازؔ فتح پوری، مرزا واجد حسین یگانہؔ چنگیزی، جاں نثار حسین اختر، چودھری محمد اسلم، عباسؔ علی خاں، بےخودؔ فیض آبادی، حافظ جلیلؔ حسن مانک پوری خلیل رحمٰن خلیف فیض آبادی، سید ریاضؔ خیر آبادی، سید خلیل احمد، شمیمؔ خیر آبادی، ریاست حسین شوق بہرائچی، عزیز احمد عزیزؔ، مولوی عبدالحی مخلصؔ، سید مہدی حسن مہدیؔ، محمد وسیم انصاری، فضاؔ ابن فیضی، کیفیؔ اعظمی، خلیل الرحمٰن اعظمی، سردار جعفری، اختر الایمانؔ، ڈاکٹر بشیر بدرؔ، پروفیسر ملک زادہ منظور، بیکلؔ اتساہی، غلام ربانی تاباںؔ، مجروح سلطان پوری، وامقؔ جونپوری، وسیمؔ بریلوی، انور جلال پوری، ڈاکٹر ماجدؔ دیوبندی، ڈاکٹر نوازؔ دیوبندی اور انجم بارہ بنکوی وغیرہ جیسے بہت سے اہم شعراء ہیں۔ سب کا نام شامل کرنا مقالہ کی طوالت کا باعث ہوگا۔(۵-۶)

اتر پردیش میں مرثیہ نگاری:

نوابان اودھ کے دور میں اتر پردیش میں مرثیہ نے ترقی پائی۔ واجدؔ علی شاہ کئی دیوان اور مثنویوں کے مصنف ہیں کم وبیش سیکڑوں کتابیں تصنیف کی ہیں سیکڑوں مرثیے اور سلام کہے ہیں اسی طرح دیگر مرثیہ نگاران اتر پردیش نے بہت اعلیٰ پائے کے مرثیے کہے ہیں۔ مرثیہ نگاری کے موجد انیسؔ بھی سرزمین اتر پردیش سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کو مرثیہ کی دنیا کا بادشاہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ وہ عظیم ہستیاں ہیں جن سے تمام اردو داں طبقہ اچھی طرح واقف ہے۔

اتر پردیش میں قصیدہ نگاری:

شمالی ہند میں اردو کا پہلا قصیدہ سوداؔ ہی کا ہے، جو عالمگیر ثانی کی مدح میں ہے۔ جب سلطنت مغلیہ کا دیا ٹمٹما رہا تھا اس وقت دلّی کی ادبی محفل منتقل ہوکر فرخ آباد، فیض آباد اور لکھنؤ کے درباروں میں آبسی۔ ادبی سرپرستی کے بغیر قصیدہ گوئی کو فروغ نہیں ہوسکتا اس دور میں اتر پردیش سب سے بڑا ادبی مرکز بن گیا تھا۔ اس لئے شمالی ہند کی قصیدہ گوئی دلّی کی نہیں بلکہ اتر پردیش کی قصیدہ گوئی ہے۔ ابتدائی قصیدہ گو مثلاً سوداؔ، میرؔ، قائمؔ اور حسرتؔ وغیرہ کی نشونما دلّی میں ہوئی لیکن ایک قصیدہ گو کی حیثیت سے یہ لوگ فرخ آباد، فیض آباد اور لکھنؤ کے درباروں میں کامیابی سے ہمکنار ہوئے۔ سوداؔ نے چند قصائد دلّی میں لکھے تھے لیکن ان کے بیشتر قصائد کے ممدوحین اتر پردیش ہی کے امراء ہیں۔ اتر پردیش میں الہ آباد، فرخ آباد، ٹانڈہ، رامپور، لکھنؤ فیض آباد وہ چند خاص مراکز تھے جہاں درباری اور جاگیردارانہ سرپرستی میں شعراء کے گروہ جمع ہوئے پھر خیر آباد، بلگرام، کاکوری،

سنڈیلہ، غازیپور، چریاکوٹ، محمد آباد، اعظم گڑھ، بنارس، جون پور، بدایوں، امیٹھی، بریلی، مرادآباد، امروہہ، شاہجہاں پور، سہارنپور، آگرہ اور ردولی وغیرہ میں علمی مجلسیں گرم رہتی تھیں۔ان کی بدولت اترپردیش میں قصیدہ گوئی کے کئی مراکز قائم ہوئے۔(۷)

اترپردیش کے اردو نثر نگار:

فقیر محمد خان گویا متوفی ۱۸۵۰ء شاعر بھی تھے لیکن انہیں شہرت ''دبستان حکمت'' سے ملی جو''انوار سہیلی'' کا اردو ترجمہ ہے۔انشاءاللہ خان انشاء نے لکھنؤ کی داستان نگاری میں ایک اہم رول ادا کیا ہے انھوں نے رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی کہانی لکھی جس میں فارسی اور عربی کے الفاظ نہیں ہیں۔ان کی کتاب دریائے لطافت فارسی زبان میں اردو صرف ونحو منطق ومعنی اور اردو قواعد کی پہلی کتاب ہے۔

اردو کے پہلے ڈرامہ نگار واجد علی شاہ ہیں انہوں نے ولی عہدی کے زمانے میں رادھا کنہیا کی داستان محبت پر مبنی ایک ناٹک لکھا، ۱۸۴۳ء میں اسے ڈرامہ کی عملی صورت میں کھیلا گیا۔ سید آغا حسن امانت لکھنوی لکھنؤ میں پیدا ہوئے انہوں ڈراما ''اندرسبھا'' ۱۸۵۳ء میں لکھا جو اسی سال اسٹیج بھی کیا گیا۔رونق بنارسی متوفی ۱۸۸۶ء نے'' کال کا بھوگ''،''چنبیلی''،'' گلاب اور میاں پسوؤ''،''بیوی کھٹمل'' کے نام سے ڈرامے لکھے ان کے دوسرے ڈراموں میں ''لیلیٰ مجنوں''،''پورن بھگت''،''عاشق صادق''،''فریب فتنہ''اور''ہیر رانجھا'' شامل ہے۔احسن لکھنوی متوفی ۱۹۳۵ء نے''خون ناحق''،''بزم فانی''،''دلفروش''،''بھول بھلیاں''اور''چندراولی'' جیسے ممتاز ڈرامے لکھے۔

اترپردیش کے ناول نگار:

بیسویں صدی کی ابتداء میں اردو افسانے کو جتنی اہمیت ملی اتنی ناول کو نصیب نہیں ہوئی۔ یہ اعزاز پریم چند کو حاصل ہے کہ انہوں نے متعدد ناول لکھ کر اس صنف نثر کو مضبوط بنیاد فراہم کردی۔سجاد ظہیر کا ناولٹ ''لندن کی ایک رات'' نئے سماجی شعور کی بیداری کا اطلاع نامہ ہے۔عصمت چغتائی کا ناول ''ٹیڑھی لکیر''،''ضدی''،''معصومہ''،''عجیب آدمی''،''ایک قطرہ خون''اور ''سودائی'' بہت اہم ہیں جن کے ذریعہ انہوں نے معاشرتی مسائل کی عکاسی کی ہے۔قراۃ العین حیدر کا ناول ''آگ کا دریا''،'' آخری شب کے ہمسفر''،'' چاندنی بیگم'' مشہور زمانہ ہے۔اوپندرناتھ اشک کا ناول ''ستاروں کا کھیل'' ہے۔عزیز احمد متوفی ۱۹۷۸ء کو''نمود ہوس''،''مرمر اور خون'' جیسے رومانی ناولوں سے شہرت ملی۔(۸)

عظیم بیگ چغتائی، نسیم حجازی، راجندر سنگھ بیدی، محمد احسن فاروقی، حیات اللہ انصاری، خواجہ احمد عباس، شوکت صدیقی، خدیجہ مستور، جمیلہ ہاشمی، انتظار حسین، بانو قدسیہ، قاری عبدالستار اور جیلانی بانو وغیرہ جیسے اور بہت سے اہم ناول نگار اترپردیش میں پیدا ہوئے جنھوں نے اپنے ناولوں کے ذریعہ اردو زبان وادب کی دنیا میں بیش بہا اضافہ کیا ہے۔(۹)

اترپردیش کے افسانہ نگار:

برصغیر کی آزادی اپنے ساتھ فرقہ وارانہ فسادات کا نیا موضوع اپنے ساتھ لے کر آئی تھی۔ایسے میں قرۃ العین حیدر، پریم چند، خواجہ احمد عباس، عصمت چغتائی اور احمد ندیم قاسمی نے اس موضوع کو سیاسی بصیرت اور معاشرتی آگاہی سے برتا اور ایسے افسانے لکھے جس سے انسانی بربریت تو سامنے آ گئی لیکن درد کی تسکین نہ ہو سکی۔منفی سیاست کی پیدا کردہ ہیجانی کیفیت ختم ہوئی تو سعادت حسن منٹو نے ''ٹوبہ ٹیک سنگھ''، حیات اللہ انصاری نے'' شکر گزار آنکھیں''، عزیز احمد نے'' کالی رات''، راجندر سنگھ بیدی نے ''لاجونتی''، صلاح الدین اکبر نے'' البم اور سائے''، رامانند

ساگر نے ''بھاگ ان بردہ فروشوں سے'' اور بلونت سنگھ نے ''پہلا پتھر'' جیسے افسانے لکھے۔قرۃ العین حیدر نے ''ستاروں سے آگے''، ''شیشے کے گھر'' جیسے افسانے لکھے، جلا وطن، ہاؤزنگ سوسائٹی، سیتاہرن، چائے کے باغ، دلربا اور دوسرے متعدد طویل افسانے لکھے۔اشفاق احمد، انتظار حسین، رام لعل، اے حمید، شوکت صدیقی، جوگیندر پال، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور، ابراہیم جلیس، غلام الثقلین نقوی، ممتاز شیریں، جمیلہ ہاشمی، بانو قدسیہ، محمد حسن فاروقی، جیلانی بانو، شکیلا اختر، قاضی عبدالستار، عابد سہیل اور عصمت چغتائی وغیرہ اتر پردیش کے اہم افسانہ نگار ہیں جنہوں نے اردو ادب کی دنیا میں گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔(۱۰)

حوالہ جات

۱۔''اردو ادب کی مختصر تاریخ''
از ڈاکٹر انور سدید، ص۔۳۴۔۳۳
۲۔'اردو ادب کی مختصر تاریخ'' از ڈاکٹر انور سدید، ص۔۳۸
۳۔'اردو ادب کی مختصر تاریخ'' از ڈاکٹر انور سدید، ص۔۱۲۹
۴۔'اردو ادب کی مختصر تاریخ'' از ڈاکٹر انور سدید، ص۔۱۷۵
۵۔''آپ۔تذکرہ شعرائے لکھنؤ'' از عرفان عباسی، ص۔۲
۶۔''آپ تھے' از عرفان عباسی، ص۔۳۔۲
۷۔''قصیدہ نگاران اتر پردیش' از علی واد زیدی، ص۔۴۷۔۴۶
۸۔''لکھنؤ کا شاہی اسٹیج'' از مسعود حسن رضوی ادیب، ص۔۹۷
۹۔''اردو ادب کی مختصر تاریخ'' از ڈاکٹر انور سدید، ص۔۲۔۱
۱۰۔''اردو ادب کی مختصر تاریخ''
از ڈاکٹر انور سدید، ص۔۵۷۶

❖❖❖

Maryam Jameela
D/o Ashfaq Ahmad KHarad
Husain Pura, Mau
Mob. 8115599485

غزل

جو پل بھر کو غافل نظر ہوگئی
تو ہر شے اِدھر کی اُدھر ہوگئی

گھڑی بھر اٹھائی جو ہم نے نظر
تو نیچی وہ اونچی نظر ہوئی

لگا بارہا اب گئی زندگی
مگر جیسے تیسے بسر ہوگئی

عجب رنگ لایا ہے ابر کرم
زمیں خون سے تر بہ تر ہوگئی

فقط بادلوں کا اندھیرا ہے یہ
گھڑی کہہ رہی ہے سحر ہوگئی

جو کونپل نہ نوچی گئی وقت پر
وہی زہر کا اب شجر ہوگئی

صفی انور یانی

Safi Anwar Yani
Mohalla Manpur
Muradabad (U.P)
Mob. 9997102595

جاوید ساحل

"نقش محبت" عشق نبی کا ترجمان

شاعر فتحپوری کا نعتیہ مجموعہ "نقش محبت" میرے سامنے ہے اس پر مجھے اظہار خیال کرنے کا حکم ہوا۔ نعت کہنا یا نعت گوئی پر کچھ لکھنا تلوار کی دھار پر چلنے کے مترادف ہے۔ اکابرین نعت کو بھی شاعری کی صنف مانتے ہیں لیکن میں ان سے اتفاق نہیں رکھتا کیونکہ نعت شاعری سے بہت بلند ہے۔ شاعری کرنا تو آسان ہے مگر نعت کہنا بہت مشکل ہے۔

شاعر فتح پوری فتحپور جیسی زرخیز زمین سے تعلق رکھتے ہیں لیکن ہائی اسکول کے بعد ہی کانپور آ گئے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ شارق ایرایانی کے روبرو زانوئے تلمذ تہہ کیا، جو جگر مرادآبادی کے شاگرد تھے۔ اس طرح آپ کا سلسلہ داغ سے جا ملتا ہے۔ میں نے شاعر فتح پوری کی غزلیہ شاعری کو خوب پڑھا ہے اور سنا بھی ہے غزل میں تو آپ کو کمال حاصل ہے۔ لیکن یہاں بات ان کی غزل پر نہیں نعت گوئی پر ہو رہی ہے۔ اس سے پہلے بھی ایک نعتیہ مجموعہ "صہبائے حقیقت" شائع ہو چکا ہے اور یہ دوسرا نعتیہ مجموعہ ہے جو اشاعت کی منزلوں میں ہے۔ نعت جیسی نازک صنف میں بھی شاعر فتح پوری نے اپنے جذبات حقیقی کی عکاسی کی ہے۔ جب وہ نعت کہتے ہیں تو عشق نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں ڈوبے ہوئے نظر آتے ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کا جو دعویٰ کرتے ہیں وہ ان کی شاعری میں بھی نظر آتا ہے ان کی ایک مدت سے خواہش تھی کہ روضۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا دیدار نصیب ہو اور یہ تمنا ان کی نعت میں جا بجا نظر آتی ہے۔

شاعر بھی چاہتا ہے مدینے میں حاضری
قصہ وہیں حیات کا ہو اے خدا تمام

قریب روضہ اوج شوق پر جانے کا موقع دو
مری قسمت کو بھی آقا سنور جانے کا موقع دو

ہم اپنی زندگی میں روضہ اقدس کو دیکھ آئیں
مدینہ ہے جدھر ہم کو ادھر جانے کا موقع دو

دیکھ لوں عکس روئے نبیؐ
لے چلو مجھ کو کوئے نبیؐ

ان کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے یہ اشعار اللہ کی بارگاہ میں قبول ہوئے اور ان کو عمرہ کرنے کی توفیق نصیب ہوئی۔ اور جب انھوں نے گنبد خضریٰ کا دیدار کیا تو برجستہ کہہ اٹھے:

نہ پوچھو گنبد خضریٰ کا منظر
حسین و پرکشش ہے دلنشیں ہے

نعت کہنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ کانپور میں اگر نعت گوئی کی بات کی جائے تو خالص نعت گو شاعر جناب قاسم حبیبی برکاتی ہی نظر آتے ہیں۔ نعت کہنے کا ہنر تو اللہ کی طرف سے انسان کو ودیعت ہوتا ہے۔ ورنہ کسی شاعر نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے:

محمدؐ اسم ہے ممدوح ذات کبریائی کا
کرے دعویٰ اگر کوئی تو دعویٰ ہے خدائی کا

مذکورہ بالا شعر سے یہ معلوم ہوا کہ سرورکونین کی ثنا عام انسانوں کے بس کی بات نہیں ہے پھر بھی عاشقان رسولؐ سے جو بن پڑتا ہے وہ اس طرح اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔ اور یہی عشق ہے جس کی ترجمانی شاعر فتح پوری کے کلام میں بدرجہ اتم موجود ہے۔

مدحت سرور کونین لکھوں میں شاعر
تاکہ ہو جائے سرحشر شفاعت میری
نعت کے شعر ہی کافی ہیں یہ کہنے کیلئے
صرف سرکار دو عالم سے ہے نسبت میری

شاعر فتح پوری تقریباً ۱۹۵۱ سے شاعری کررہے ہیں۔ نعت گوئی کب شروع کی اس کا تو پتہ نہیں لیکن پچھلے ۲۵ برسوں سے میں ان کی نعتیہ شاعری کو پڑھ اور سن رہا ہوں۔ ان کے اشعار میں جگہ جگہ تلمیحات بھی نظر آتی ہیں جن سے ان کی علمی بصیرت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ شعر دیکھیں:

وجہ اعجاز شق القمر کون ہے
جس کو کہتے ہیں خیر البشر کون ہے
شجر حجر کا ذکر کیا قمر کا معجزہ ہے کیا
مرے نبی تو کنکروں کو بولنا سکھا گئے
معجزہ ہے یہ ہمارے سرور کونین کا
ڈوبنے کے بعد سورج کا نکلنا دیکھئے

مذکورہ بالا اشعار میں جن واقعات کی طرف اشارہ ہے ہم ان اشعار کی تشریح تب تک نہیں کرسکتے جب تک ان واقعات کا علم نہ ہو۔ میں ان واقعات کا ذکر نہیں کرونگا کیوں کہ مضمون کو بے وجہ طول دینا مقصد نہیں ہے۔ شاعر فتح پوری روز محشر میں حساب سے خوف زدہ تو نہیں ہوتے کیوں کہ ان کو یقین ہے شافع محشرؐ سے ان کی محبت ان کو محشر میں بھی سرخ رو رکھے گی لیکن وہ یہ بھی کہتے ہیں۔

حشر میں کیا منہ دکھاؤں گا مرے رب کریم
آئینہ بن کر زمانے میں اگر چمکا نہیں
جہاں میں رہ کر ہم اپنے عیبوں کی پردہ پوشی کرینگے لیکن
یہ سوچتے ہیں بروز محشر عیوب کیسے چھپائیں گے ہم

شاعر فتح پوری کو ڈر اس بات کا ہے کہ میں عشق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا دعویٰ تو کررہا ہوں لیکن کیا میں اس لائق ہوں، انسان تو گناہوں کا پتلا ہے، میں اپنے محبوب حضرت محمد مصطفےٰؐ کو منہ دکھا بھی پاؤں گا کہ نہیں۔ اقبال نے کہا بھی ہے:

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر
روز محشر عذر ہائے من پذیر
لیک اگر دانی حسابم ناگزیر
از نگاہ مصطفےٰ پنہاں بگیر

نعت گوئی پر لکھنے کیلئے یہ چند صفحات کم ہیں اس پر جتنا بھی لکھا جائے کم ہے۔ یوں لگتا ہے بس لکھتا رہوں لیکن سیرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر قلم اٹھانا آسان کام نہیں اور چند سطور میں تو ممکن ہی نہیں۔ بس شاعر فتح پوری کی نعت گوئی پر ایک رائے دینی تھی سو وہی کوشش کی ہے۔

❖❖❖

Javed Sahil
105/146, SOOFI APARTMENT
INSPECTOR ROAD, NEAR MOHAMMAD
ALI PARK, CHAMANGANJ,
KANPUR NAGAR-208001
Mob 7985251065

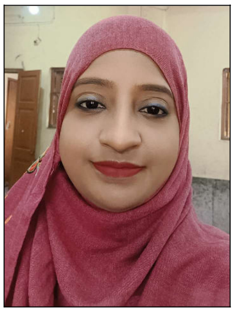

غزل

جس نے لی جان مری وہ مرا جاناں نہ ہوا
لاکھ چاہا اُسے پر وہ مرا چنداں نہ ہوا

کیسے بے حس سے لگا بیٹھی ہوں میں دل اپنا
وہ مرا درد ہوا، درد کا درماں نہ ہوا

کتنے ارمانوں کو ہم نے ہے دبایا اس میں
ایسا اجڑا یہ جہاں دل کا، گلستاں نہ ہوا

موت پر میری بہائے ہیں ہر اک نے آنسو
جب میں زندہ تھی تو کوئی مرا پرساں نہ ہوا

کیا لگاتا کوئی اندازہ مرے زخموں کا
درد دل کا کبھی چہرے سے نمایاں نہ ہوا

راہ میں نظریں بچھائے تھی میں جس کی خاطر
دو گھڑی کے لیے بھی وہ مرا مہماں نہ ہوا

تھا ستم اس کا گراں میرے لیے فرزانؔہ
تحفہ تو تحفہ ہوا وہ کبھی ارزاں نہ ہوا

فرزانہ پروین

Farzana Parveen
Assistant Teacher
The Quraish Institute
5/1, Kimber Street
Kolkata - 700017
Mobile :7003222679

تخلیق کاروں سے گزارش

- ماہنامہ ”خبرنامہ“ کے لئے معیاری نگارشات ہی ارسال کریں۔ ہر تخلیق پر غیر مطبوعہ کی تصدیق ہونا لازمی ہے۔ ساتھ ہی مکمل ایڈریس، موبائل نمبر، پاسپورٹ سائز تصویر بھیجیں۔
- مضمون بہت طویل نہ ہو، زیادہ سے زیادہ دو ہزار الفاظ ہوں۔
- ای۔میل سے بھیجی ہوئی نگارشات کا پروف اچھی طرح پڑھ لیں، ان پیج فائل کے ساتھ پی ڈی ایف بھی بھیجیں۔
- تخلیقات کے ساتھ بینک اکاؤنٹ میں درج نام، بینک کا نام، شاخ کا نام، آئی۔ ایف۔ ایس۔ سی نمبر انگریزی میں لکھ کر بھیجنا ضروری ہے، پاس بک کی فوٹو کاپی یا کینسل چیک بھی منسلک کرنے کی زحمت کریں۔

اترپردیش اردو اکادمی
بچوں کے مزاج ومعیار کے لحاظ سے ماہنامہ
باغیچہ
پورے آب وتاب کے ساتھ شائع کر رہی ہے۔ اس کے فروغ اور توسیع کے لئے آپ کا تعاون درکار ہے۔
آپ اپنی تخلیقات بھیج کر، خود خریدار بن کر اور دوسروں کو ترغیب دے کر اور بچوں میں اردو رسائل پڑھنے کا ذوق پیدا کر کے
اردو کی خدمت کر سکتے ہیں

شبانہ عشرت

محنت کش طبقے کا نمائندہ شاعر: ساحرؔ لدھیانوی

ساحرؔ لدھیانوی کا نام اردو ادب میں ایک لافانی شاعر اور فلمی نغمہ نگار کے طور پر تابندہ اور درخشندہ ہے اور رہے گا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی تابنا کی میں اضافہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ساحرؔ نے ایک لازوال شعری وراثت ہمیں سونپ دی ہے۔ ساحرؔ واقعی ایک غیر معمولی صلاحیت کا حامل انسان تھا، جس نے زندگی اور معاشرے کے تضادات کا احاطہ کرتے ہوئے اپنی شاعری کے ذریعے انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے اور اس میں کچھ تعجب کا محل بھی نہیں کیوں کہ ساحرؔ جیسے حساس فنکار کے لئے جس نے زندگی کی ناہمواری کا مشاہدہ ہی نہیں بلکہ تجربہ بھی کیا تھا، یہ ممکن ہی نہ تھا کہ وہ محنت کش طبقے کے گونا گوں مسائل سے نظریں چرالے۔

واقعی اس خیال کی تردید آسان نہیں کہ ساحرؔ کے یہاں ادب اور زندگی کی وقیع قدروں کے معنوی امتزاج اور ان کی پاسداری کو اولیت حاصل ہے۔ ساحرؔ نے اپنی شاعری میں اپنے زمانے کے سماجی حالات و ماحول کی سچی تصویر کشی کی ہے۔

محنت کشوں کے تعلق سے ساحرؔ کی شاعری یقیناً محض تصورات و تخیلات کی زائیدہ یا صرف اس کے زور بیان کی پروردہ نہیں۔ ساحرؔ نے صرف سنی سنائی باتوں کے سہارے کوئی ہوائی نہیں اُڑائی ہے بلکہ یہ سب کچھ شاعر کے تجربے اور مشاہدے کا حصہ ہے۔ ساحرؔ نے فاقہ و غربت، سرمایہ و محنت کی کشاکش اور نادار عوام کی افلاس زدگی کا بغور مطالعہ کیا تھا۔ لہٰذا طبیعت کی یہ بیزاری، محبت سے بیزاری نہیں بلکہ نفرت پروری سے بیزاری ہے اور ساحرؔ کے یہاں اس کا اظہار اس لئے بھی شدید ہے کہ ان کا وہ احساس بیدار ہے جو ہر ناانصافی کے خلاف خواہ کسی بھی سطح پر ہوا سے سرکشی پر آمادہ کرتا ہے۔

ساحرؔ نے اپنی زندگی میں طبقاتی تقسیم کی کارفرمائی اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھی تھی۔ اس کا منظر و پس منظر اپنی ماں کی زبان حال و قال سے سنا تھا۔ اس لئے اسے تمام مسائل کا خوب اندازہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ساحرؔ کی شاعری بہر صورت ہندوستان کے محنت کش طبقے کی ترجمانی کرتی ہے۔ اس کی ایک اہم نظم ’’کل اور آج‘‘ میں کسانوں، جاگیرداروں اور ساہوکاروں کا جو کردار نمایاں ہوا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ یہ نظم نہ صرف ہندستانی دیہاتی عوام کے معاشی و معاشرتی تہذیبی زندگی کو منعکس کرتی ہے بلکہ طبقاتی روابط کے روایتی تصور کو بھی سامنے لا دیتی ہے۔

رت بدلے گی، پھول کھلیں گے،
جھونکے مدھ برسائیں گے
چرواہے بنسی کی دھن پر، گیت فضا میں بوئیں گے
ہل جوتے گی کھیتوں میں الھڑ ٹولی دہقانوں کی
دھرتی سے پھوٹے گی محنت فاقہ کش انسانوں کی
فصلیں کاٹ کے محنت کش غلے کا ڈھیر لگائیں گے
جاگیروں کے مالک آکر سب پونجی لے جائیں گے
بوڑھے دہقانوں کے گھر بنیے کی قرقی آئے گی
اور قرضے کے سود میں کوئی گوری بیچی جائے گی

یہاں ہمارا خاص موضوع ''محنت کش طبقے کا نمائندہ شاعر: ساحؔر لدھیانوی'' ہے۔ اردو میں ''محنت'' کے لفظی معنی مشقت، مزدوری اور تکلیف کے ہیں اور ''محنت کش'' کا لغوی مترادف ''جفاکش'' ہے۔ معاشیات کی عام نصابی کتابوں کے مطابق ''محنت کش طبقہ'' وہ طبقہ ہے جو کام کرنا پسند کرے اور اُسے مناسب مزدوری پر کام بھی مل جائے۔ اس طبقہ میں عموماً ۱۵ سال سے ۶۴ سال کی عمر کے لوگ ہوتے ہیں جن میں کام کرنے کی ہمت بھی ہوتی ہے اور طاقت وصلاحیت بھی۔

اس سلسلہ میں مزدوری قوانین اور مزدور وسرمایہ دار کے تعلق سے اشترا کی نظریات کی تفصیل میں جانے کا نہ تو یہاں موقع ہے اور نہ ہی اس کی ضرورت، البتہ اِس جہت سے کچھ اشارے کئے بغیر میں نہیں رہ سکتی کہ ایک بالغ نظر شاعر کے قلم سے محنت کش طبقہ کی نمائندگی کا حق اسی وقت ادا ہوسکتا ہے جب تمام تر نظریاتی، تاریخی، معاشی ومعاشرتی اور اخلاقی رعایتوں کے ساتھ محنت کے تینوں پہلو، مشقت، مزدوری اور تکلیف کو سامنے رکھتے ہوئے باتیں کی گئی ہوں۔ چنانچہ اس لحاظ سے ہم دیکھتے ہیں کہ ساحؔر کے گیت ہوں یا اس کی نظمیں، بہرصورت اُن میں محنت کش طبقہ کے استحصال کی دیرینہ روایتوں کا بیان ہی نہیں بلکہ عمارت سازی، کارخانوں میں مزدوری اور کاشتکاری کے حوالے سے، مزدوروں کے ساتھ سرمایہ داروں، جاگیرداروں، رئیسوں اور نوابوں کے استحصالی رویے کی اور اُن کے ظلم وستم اور عیاشی کے حوالے سے، مزدور عورتوں یا مزدور گھرانے کی عورتوں کے احوال، محنت کرنے والوں کی غربت، فاقہ کشی، یاسیت، مقروضیت اور جبری عریانیت یا نیم برہنگی کے حوالے سے باتیں بھی ہوئی ہیں۔

یہ ٹھیک ہے کہ ساحؔر کے یہاں احسان دانؔش جیسے مزدور شاعر اور مخدوؔم و مجروؔح اور سردار جیسے اشترا کی شعرا کا انداز و بیان نہیں، یہاں شاعر انقلاب و شباب کی پتھر توڑتی ہوئی عورت سے بھی ہماری ملاقات نہیں ہوتی ہے اور پانی کا لباس پہنے ہوئے، رمزؔ عظیم آبادی کے جفاکش مردِ مزدور بھی ہمیں دکھائی نہیں دیتے ہیں، لیکن اظہارِ حالات وکیفیات میں معاصرین سے اِس فرق کے باوجود، ساحؔر کی شاعری میں محنت کش طبقہ کی برجستہ موثر اور مفید مطلب نمائندگی ایک نہیں انیک جہتوں سے روشن ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں کہ ساحؔر کے یہاں اسم صوت کی صورت میں ''زور لگاکے ہیّا......'' سے محنت کشوں کی نمائندگی ہو رہی ہے بلکہ اُس کے گیت ''وہ صبح کبھی تو آئے گی'' اور ''ساتھی ہاتھ بڑھانا'' کے بول بھی اپنی رجائیت، بے خوفی اور اتحاد واعتماد کی پیامی ویقینی کیفیت کے ساتھ محنت کشوں کے حال و مستقبل کی بھرپور نمائندگی کر رہے ہیں۔

وہ صبح کبھی تو آئے گی
بیتیں گے کبھی تو دن آخر یہ بھوک کے اور بیکاری کے
ٹوٹیں گے کبھی تو بت آخر دولت کی اجارہ داری کے
جب ایک انوکھی دنیا کی بنیاد اٹھائی جائے گی
سنسار کے سارے محنت کش کھیتوں سے، ملوں سے نکلیں گے
بے گھر، بے در، بے بس انساں تاریک بلوں سے نکلیں گے

دنیا امن اور خوش حالی کے پھولوں سے سجائی جائے گی
وہ صبح ہمیں سے آئے گی

ساتھی ہاتھ بڑھانا
ہم محنت والوں نے جب بھی مل کر قدم بڑھایا
ساگر نے رستہ چھوڑا، پربت نے سیس جھکایا
فولادی ہیں سینے اپنے، فولادی ہیں بانہیں
ہم چاہیں تو پیدا کردیں چٹانوں میں راہیں
ساتھی ہاتھ بڑھانا
محنت اپنے لیکھ کی ریکھا، محنت سے کیا ڈرنا
کل غیروں کی خاطر کی، آج اپنی خاطر کرنا
اپنا دکھ بھی ایک ہے ساتھی اپنا سکھ بھی ایک
اپنی منزل سچ کی منزل اپنا رستہ ایک
ساتھی ہاتھ بڑھانا
ماٹی سے ہم لعل نکالیں، موتی لائیں جل سے
جو کچھ اس دنیا میں بنا ہے بنا ہمارے بل سے
کب تک محنت کے پیروں میں دولت کی زنجیریں
ہاتھ بڑھاکر چھین لو اپنے خوابوں کی تعبیریں

نوع بنوع استحصال میں گھرے محنت کشوں کا حال کیا ہے؟ اِسے دکھانے سے زیادہ اپنے معاصرین میں ساحؔر کا انفراد یہ ہے کہ اُس نے بار بار یہ دکھایا ہے کہ مزدوروں کا یہ حال کیوں ہے اور کیسے مستقبل قریب میں یہ ہمیشہ کے لئے بدل سکتا ہے۔ ساحؔر کی شاعری محنت کشوں کی نمائندگی کرتے ہوئے سرمایہ داروں اور ساہوکاروں پر مستقبل کا خوف طاری کردینے اور نفسیاتی طور سے اُن کے زعم توڑ دینے میں کوشاں ہی نہیں بہت ہی کامیاب بھی ہے۔ میں یہ مانتی ہوں کہ ؎

پونجی واد سے دب نہ سکے گا یہ مزدور کا جھنڈا
محنت کا حق لے کے رہے گا
محنت کش انسان کا جھنڈا
جیتے گا میدان
ہمارا پیارا لال نشان

کی صورت میں مزدوروں کی نمائندگی کے حوالہ سے ساحؔر کی شاعری نری اشتراکیت کا پروپیگنڈہ بھی بنی ہے، مگر اس رُخ سے اس کی کامیابی بالکل ہی روشن اور منفرد ہے کہ اس نے بہرصورت محنت کش طبقہ کی ذہن سازی کی ہے۔ مزدوروں اور کسانوں میں بیداری لانے کے لئے انہیں سوچنے اور ہمت کے ساتھ بروقت اُٹھ کھڑے ہونے کی ضرورت کا احساس دلایا ہے اور غفلت کے ماروں کو جگانے اور رجائی مستقبل کے تصور کو یقینی مناظر میں مجسم کر کے دکھا دینے کی فکری وفنی ہنرمندی، بلند آہنگی اور طنطنہ شعاری کے رُخ سے مزدوروں اور جفاکشوں کی مفید مقصد اور سچی نمائندگی کی ہے۔ یہ صرف محنت کشوں کے احوال کی نہیں بلکہ موثر مخاطبت کے ساتھ اُن فکروسوچ کی نمائندگی بھی ہے اور لطف یہ کہ اس کے ساتھ لرزہ براندام سرمایہ داری کی بھی اس سے عکاسی ہوتی چلی گئی ہے۔

اشتراکی شعراء رومان سے حقیقت پسندی کی طرف آئے ہیں، یہی کیفیت ساحؔر کے یہاں بھی ہے، مگر اس فرق کے ساتھ کہ مزدوروں کی نمائندگی کے باب میں وہ فیضؔ کی طرح دبے پاؤں انقلاب کی بات کرتے ہوئے نہیں بلکہ کھلے بندوں انقلاب کا مژدہ سناتے ہوئے ہمارے سامنے آتا ہے۔ ساحؔر کی نظم ''کسی کو اداس دیکھ کر'' اور ''میرے گیت'' اس کے گواہ ہیں کہ ساحؔر نے رومان سے حقیقت کی طرف آنے کے محرکات میں محنت کش طبقوں کے احوال کا خاص طور سے حوالہ دیا ہے ؎

کسی کو اداس دیکھ کر
تمہارے غم کے سوا اور بھی تو غم ہیں مجھے

نجات جن سے میں اک لحظہ پا نہیں سکتا
یہ اونچے اونچے مکانوں کی ڈیوڑھیوں کے تلے
ہر ایک گام پہ بھوکے بھکاریوں کی صدا
یہ کارخانوں میں لوہے کا شور وغل جس میں
ہے دفن لاکھ غریبوں کی روح کا نغمہ

مرے سرکش ترانوں کی حقیقت ہے تو اتنی ہے
کہ جب میں دیکھتا ہوں بھوک کے مارے کسانوں کو

اِس نوعیت کی نظموں میں ساحر کے یہاں نغمہ کو نعرہ بنا دینے اور للکار کو کھلی دعوت پیکار تک لے جانے کی کیفیت پوری طرح نمایاں ہے۔ ''اجنبی محافظ'' میں 'بھوکے دہقانوں کے ماتھے کا عرق' ہویا ''بلاوا'' میں 'جاگو اے مزدور کسانو' سے لے کر 'دیکھو دور افق کی ضو سے جھانک رہا ہے سرخ سویرا' کی صدا، بہر حال اشتراکیت کے خیمے سے محنت کش طبقہ کے ایک کامیاب شاعر ہی کی صدا ہے:

جاگو اے مزدور کسانو
اُٹھو اے مظلوم انسانو
دھرتی کے اَن داتا تم ہو
جگ کے پران ودھاتا تم ہو
دھنیوں کی خوش حالی تم ہو
کھیتوں میں ہریالی تم ہو
اونچے محل بنائے تم نے
شاہی تخت سجائے تم نے
ہیرے لعل نکالے تم نے
نیزے بھالے ڈھالے تم نے
ہر بغیا کے مالی تم ہو
اس سنسار کے والی تم ہو
وقت ہے دھرتی کو اپنا لو
آگے بڑھو، ہتھیار سنبھالو
جاگو......
دیکھو دور افق کی ضو سے جھانک رہا ہے سرخ سویرا

ساحر نے 'لینن' پر نظم لکھی ہو یا 'جواہر لال نہرو' پر، بہر حال اُن میں ایسے حصے موجود ہیں جو اسے محنت کشوں کے نمائندہ شاعر کی حیثیت سے ہمارے سامنے لا دیتے ہیں ۔

عیش ایک کا لاکھوں کی غربت سے پنپتا تھا
منسوب تھی یہ حالت قدرت کے حسابوں سے
ہم مٹا دیں گے سرمایہ و محنت کا تضاد
یہ عقیدہ ، یہ ارادہ ، یہ قسم لے کے چلو

ماضی کا صیغہ اصولاً یقین کا اور مستقبل کا صیغہ امید کا فائدہ دیتا ہے اور حال کا صیغہ خطاب کے رنگ تاثیر میں اضافہ کرتا ہے، پھر کورس میں گانے سے بھی ایک خاص فضا اُبھرتی ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ محنت کش طبقہ کی نمائندگی میں ساحر کی شاعری ان تمام صورتوں سے کام لیتی ہے۔ ''جاگیر'' کا تکراری زور بیان، ''بنگال'' کا روئے خطابت ''میرے گیت تمہارے ہیں'' کی آواز اور کورس میں گائے جانے والے اشعار ''طلوع اشتراکیت'' میں حال کی ردیف کا شعر، ''کل اور آج'' میں مستقبل کا استعمال اور ''کچھ باتیں'' کی دعوت گفتگو یہ بتانے کے لئے کم نہیں کہ انداز و آہنگ کے اعتبار سے بہر صورت نمائندگی کے سارے ہی صوتی، قواعدی اور فنی طریقے، ساحر کے یہاں اپنائے گئے ہیں:

یہ چراگاہ، یہ ریوڑ، یہ مویشی، یہ کسان
سب کے سب میرے ہیں،
سب میرے ہیں، سب میرے ہیں
ان کی محنت بھی مری، حاصل محنت بھی مرا
ان کے بازو بھی مرے، قوت بازو بھی مری

زمیں کی قوت تخلیق کے خداوندو!
ملوں کے منتظمو! ، سلطنت کے فرزندو!

آج سے اے مزدور کسانو! میرے گیت تمہارے ہیں
فاقہ کش انسانو!، میرے جوگ بہاگ تمہارے ہیں
جب تک تم بھوکے ننگے ہو، یہ شعلے خاموش نہ ہوں گے
جب تک بے آرام ہوتم یہ نغمے راحت کوش نہ ہوں گے

جشن بپا ہے کٹیاؤں میں اونچے ایواں کانپ رہے ہیں
مزدوروں کے بگڑے تیور دیکھ کے سلطاں کانپ رہے ہیں

ہل جوتے گی کھیتوں میں الھڑ ٹولی و ہقانوں کی
دھرتی سے پھوٹے گی محنت فاقہ کش انسانوں کی
فصلیں کاٹ کے محنت کش غلے کے ڈھیر لگائیں گے
جا گیروں کے مالک آ کر سب پونجی لے جائیں گے
بوڑھے دہقانوں کے گھر بنیے کی قرقی آئے گی
اور قرضے کے سود میں کوئی گوری بیچی جائے گی

جابر و مجبور کی باتیں کریں
اس کہن دستور کی باتیں کریں
تاج شاہی کے قصیدے ہو چکے
فاقہ کش جمہور کی باتیں کریں
گرنے والے قصر کی توصیف کیا
تیشہ مزدور کی باتیں کریں

ساحؔر کا تعلق پنجاب سے ہے اور شاید اسی لئے اُس نے کل کارخانہ سے نسبتاً زیادہ کھیت کھلیان کے مزدوروں کا حوالہ لیا ہے، لیکن اس سے چنداں بنیادی فرق نہیں آتا، اس لئے کہ بہر صورت ساحؔر کو ہم سرمایہ و افلاس کے ''اسی دوراہے پر'' محنت کشوں کی نمائندگی کرتے ہوئے اور ان کے حق وحمایت کی خاطر قسم کھاتے ہوئے دیکھتے ہیں، جہاں زندگی پہلے بھی شرمائی تھی لجائی تھی ۔

اب نہ ان اونچے مکانوں میں قدم رکھوں گا
میں نے اک بار پہلے بھی قسم کھائی تھی
اسی سرمایہ و افلاس کے دوراہے پر
زندگی پہلے بھی شرمائی تھی جھنجھلائی تھی

اور پھر ایک شاعر کی حیثیت سے اسے ایک طرف لہلہاتے کھیت اور دوسری طرف ''دہقان کے چھپر میں نہ بتی نہ دھواں'' دیکھ کر یہ کہتے ہوئے سنتے ہیں کہ ''مجھے سوچنے دے'' بیشک ساحؔر کی محنت کش طبقہ کے لئے یہ فکرمندی اس کی نمائندگی کے معیار اور شعری مزاج کا جیتا جاگتا ثبوت ہے ۔

بھوک اور پیاس سے پژمردہ سیہ فام زمیں
تیرہ و تار مکان، مفلس و بیمار مکیں
نوع انساں میں یہ سرمایہ و محنت کا تضاد
امن و تہذیب کے پرچم تلے قوموں کا فساد
لہلہاتے ہوئے کھیتوں پہ جوانی کا سماں
اور دہقان کے چھپر میں نہ بتی نہ دھواں

یقیناً جب کبھی اردو شاعری میں محنت کش طبقہ کے نمائندہ اور خصوصاً اشتراکیت پسند نمائندہ فنکاروں کا ذکر ہوگا تو ساحؔر لدھیانوی کا نام جلی حرفوں میں لکھا جائے گا اور احترام وممنونیت کی زبان سے اُسے بار بار پڑھا جائے گا، دہرایا جائے گا، سنایا جائے گا اور گوش حقیقت نیوش اس سے عبرت و ہمت پاتے رہیں گے۔

❖❖❖

Shabana Ishrat
C/o Late Abdul Rahman,
Milan House, Dargah Road
Pathar Ki Masjid, **Patna** - 800006
Mob. 7759882040

ڈاکٹر مہ ناز انور

حسن سلوک

آج جبکہ ساری دنیا ایک انتشار، جنگ اور تشدد کے دور سے گزر رہی ہے۔ بڑی طاقتیں چھوٹی طاقتوں پر اپنا غلبہ حاصل کرنے کے درپے ہیں جہاں ظلم و جبر، ہٹ دھرمی اور زور زبردستی کی فضا قائم ہوتی چلی جارہی ہے۔ ایسے میں لفظ حسن سلوک کی آواز کو بھلا کون سننا پسند کرے گا۔ بھلا نقار خانے میں طوطی کی نرم آواز پر کون کان دھرے گا لیکن بقول شاعر:

اک طرز تغافل ہے سو وہ ان کو مبارک
اک عرض تمنا ہے وہ ہم کرتے رہیں گے

اس کے باوجود حسن سلوک ایک ایسا عمل ہے جو ہر زمانہ اور ہر دور میں اپنی معنویت کو سمجھا تا رہا ہے۔ یہ ایک ایسا ہتھیار ہے جس کے نرم و نازک اور دھیمے لہجے کے وار سے لوگوں نے بہر حال فتح پائی ہے۔ آیئے ذرا غور کریں عہد آفرینش سے ذرا پہلے کے اس دور پر جب نہ تو یہ دنیا تھی اور نہ اس میں رہنے والا کوئی انسان۔ صرف خدا اور اس کی تعمیر کردہ جنت میں حضرت آدم اور حوا اپنے حسن سلوک اور اچھے اخلاق کی بدولت زندگی گزار رہے تھے۔ ایک فرشتہ جو خدا کا سب سے مقرب تھا۔ اسے اللہ نے محض اس وجہ سے ابلیس کا خطاب دے کر ٹھکرا دیا کہ اس نے حسن سلوک کے بجائے بد سلوکی کی۔ اس نے نخوت، غرور اور اپنی طاقت کے زعم میں حضرت آدم کے آگے سجدہ کرنے سے انکار کیا اور شاید تبھی سے لفظ حسن سلوک کی افادیت اور اس کی معنویت پر غور کیا جانے لگا۔

انسان کی خصلتوں اور عادتوں میں ہمیشہ سے اخلاق یا حسن سلوک کو ایک اہم عمل کی حیثیت دی جاتی رہی ہے۔ وہ لوگ جن میں یہ اچھی عادتیں موجود تھیں، انہیں ہزاروں سال گزر جانے کے بعد آج بھی اچھا، عظیم اور اونچے کردار والا انسان کہا جاتا ہے۔ وہ لوگ جنہوں نے حسن سلوک کے بجائے بدسلوکی اور بد اخلاقی کو اپنا شیوہ بنایا، ان کے نام بھی زندہ ہیں مگر برے کردار اور ظالم انسان کے طور پر پہچانے جاتے ہیں۔ رام اور راون میں بس یہی فرق تھا کہ ایک انسان کو بھگوان کے اوتار اور مثالی انسان ہونے کا شرف حاصل ہوا اور دوسرے کو شیطان اور بدکردار آدمی کا لقب عطا کیا گیا۔ مہا بھارت کی پوری تعلیمات محض اسی حقیقت پر مبنی ہیں کہ جب کبھی بھی محض اخلاق اور حسن سلوک کی کمی ہوئی تو لاکھوں بے گناہوں اور معصوم لوگوں کا خون بہا اور پورا کا پورا معاشرہ انتقام اور جوش کی آگ میں جھلس کر بھسم ہو گیا اور جہاں کہیں بھی غصہ کے مقابلے میں نرمی، نفرت کے مقابلے میں محبت اور بدسلوکی کے

مقابلے میں حسن سلوک سے کام لیا گیا وہاں صرف آرام، اطمینان اور انسان دوستی کی فضا قائم ہوئی بلکہ مستقبل میں بھی اس حسن سلوک کی بدولت راستے ہموار ہوتے گئے اور پوری پوری قوموں کی انفرادی پہچان اس ایک عمل کی بدولت بنتی گئی۔

آج سے تقریباً چودہ سو سال پہلے عرب کے ایسے ماحول میں ایک نیک، شریف اور حسن سلوک سے مرصع انسان نے آنکھ کھولی جہاں جنگ، نفرت، غرور، بدسلوکی اور تشدد کا ماحول تھا۔ وہاں حضرت محمدؐ نے محض اپنے اخلاق اور حسن سلوک سے پورے معاشرے کو بدل کر رکھ دیا۔ وہی معاشرہ جس کی زبان پر تلخی رچی بسی تھی اب نرم گفتاری اور اچھے اخلاق کی بدولت ایک عظیم قوم امت محمدیہ کے نام سے جانی جانے لگی۔ یہ سب کچھ محض ایک فرد اور ایک انسان کے اچھے اخلاق سے ہوا۔

حسن سلوک کس طرح سے کیا جاتا ہے، اس کے لئے کسی ریاضت یا ورزش کی ضرورت نہیں۔ اس کے لئے محنت اور مشقت کی بھی چنداں ضرورت نہیں اور نہ ہی اس کے لئے پیسہ، دولت، نماز روزے کی ضرورت ہے۔ یہ تو ایک آسان اور نہایت ہی کارآمد فعل ہے۔ حسن سلوک کسی کے ساتھ بھی زبان، ہاتھ پیر یا محض مسکرا کر بھی کیا جا سکتا ہے۔ ایک روتے ہوئے بچے کو ہنسانا بھی حسن سلوک میں داخل ہے۔ ایک نابینا کو سہارا دینا بھی حسن سلوک ہی ہے، ایک کمزور بے بس اور مغلوب انسان کو بخش دینا بھی حسن سلوک کا ہی ایک پرتو ہے۔

حضرت محمدؐ کا قول ہے کہ وہ مکارم اخلاق اور محاسن افضال کی تکمیل کے لئے ہی دنیا میں بھیجے گئے تھے۔ یہاں تک خود پروردگار عالم نے اخلاق حسنہ یا حسن سلوک کو دنیا کی سب سے اچھی اور بڑی عبادت سے تعبیر کیا ہے۔ حضرت عائشہؓ کا کہنا تھا کہ دنیا میں وہ شخص جو حسن سلوک سے واقف نہیں اسے انسان کہلانے کا حق نہیں۔ حضرت عائشہؓ نے حضرت محمدؐ کی بابت فرمایا کہ ان میں جو سب سے برتر اور اعلیٰ وصف تھا وہ حسن سلوک ہی تھا۔ حضرت محمدؐ اپنے گھر والوں، پڑوسیوں، رشتہ داروں، احباب، اصحاب، اپنوں، یہاں تک بیگانوں کے ساتھ بھی اس قدر خوش اخلاقی وملنساری کا برتاؤ فرماتے تھے کہ دوست اور دشمن سبھی آپ کے اخلاق حسنہ کے گرویدہ اور مداح ہو جاتے۔ حضرت خدیجہؓ کا بھی بیان ہے کہ ایک پیغمبر یا نبی ہونا تو بعد کی بات تھی آپ کے اندر جو رحم دلی کا عنصر تھا، حسن سلوک کی جو عادت تھی اس نے تمام عرب کے لوگوں کو آپ کا پیروکار بنا دیا تھا۔ چلئے! تھوڑی دیر کے لئے یہ سوچا جا سکتا ہے کہ وہ تو خیر پیغمبر تھے ان کا عام انسان سے کیا مقابلہ؟ مگر یہاں بات ایک ایسے عمل کی ہو رہی ہے جس کا تعلق ہر انسان کی ذات سے وابستہ ہے۔ مثال کے طور پر غصہ اور پیار، یہ دونوں کیفیتیں انسان میں موجود ہیں۔ اب ہر انسان کو یہ فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ وہ ان دونوں کیفیتوں میں سے کس کو اپنا تا ہے۔ ذرا غور کیجئے اور تھوڑی دیر کے لئے سختی اور تشدد کو بالائے طاق رکھ کر نرمی اور خوش مزاجی کا ماحول پیدا کیجئے تو صرف ہمیں ہی نہیں آپ کو بھی یقین آ جائے گا کہ حسن سلوک میں وہ طاقت، وہ جادو ہے کہ جس سے غیر کو بھی اپنا بنایا جا سکتا ہے۔ دشمن کو بھی دوستی کے کچے دھاگے میں باندھا جا سکتا ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے:

خدا گواہ کہ اخلاق میں وہ جادو ہے
کہ جس سے غیر بھی اپنے بنائے جاتے ہیں

سکھوں کی مذہبی کتاب گرو گرنتھ صاحب میں بھی ایک اچھے انسان کی سب سے بڑی پہچان یہی بتائی گئی ہے کہ اس کی زبان سے کوئی بھی ایسا لفظ نہ نکلے جو دوسروں کو تکلیف دے۔ اس میں کہا

گیا ہے کہ جن کے اندر حسن سلوک کا مادہ نہیں وہ محض تیرتھ اسنان کرنے سے پاکیزہ نہیں بن سکتے۔ ان کا شعار ایسا ہے جیسے کسی سانپ کو باہر سے دھود یا جائے مگر اس کے اندر زہر بھرا کا بھرا رہ جائے۔ گرنتھ صاحب میں بار بار اس بات کا ذکر آیا ہے کہ انسان کا وقار اس کے حسن عمل اور حسن اخلاق پر منحصر ہے اور اسی سے ایک اچھے اور سچے انسان کی پہچان ہوتی ہے۔

حسن سلوک کس طرح سے کیا جاتا ہے، اس کے لئے کسی ریاضت یا ورزش کی ضرورت نہیں۔ اس کے لئے محنت اور مشقت کی بھی چنداں ضرورت نہیں اور نہ ہی اس کے لئے پیسہ، دولت، نماز روزے کی ضرورت ہے۔ یہ تو ایک آسان اور نہایت ہی کارآمد فعل ہے۔ حسن سلوک کسی کے ساتھ بھی زبان، ہاتھ پیر یا محض مسکرا کر بھی کیا جا سکتا ہے۔ ایک روتے ہوئے بچے کو ہنسانا بھی حسن سلوک میں داخل ہے۔ ایک نابینا کو سہارا دینا بھی حسن سلوک ہی ہے، ایک کمزور بے بس اور مغلوب انسان کو بخش دینا بھی حسن سلوک کا ہی ایک پرتو ہے۔ یہاں تک کہ کسی ظالم، تشدد پسند اور گنہگار انسان کو، اسے احساس ندامت کے بعد درگذر کرنا بھی حسن سلوک کا ہی خاصہ ہے۔

تاریخ میں ایسی ہزاروں مثالیں موجود ہیں کہ گنہگار کو اس کی غلطی پر سزا دینے کے بجائے بخش دینے پر اس کی ساری برائیاں آئندہ کے لئے ختم ہو گئیں اور وہ ایک نیک دل اچھا انسان بن گیا۔ دنیا کے تمام مذاہب نے بھی ہدایت دی ہے کہ ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ حسن سلوک کرو کیونکہ یہی عادت خدا کو سب سے زیادہ پسند ہے۔

حسن سلوک ہی کا پیغام تمام صوفیائے کرام اور فقیروں سنتوں اور سادھوؤں نے بھی دیا ہے۔ اس عمل کی بدولت تصوف اور بھگتی تحریک کا بھی آغاز ہوا جس میں مساوات، عدم تشدد، عجز و انکسار کی تعلیمات کے ساتھ حسن سلوک کو انسان کا سب سے اچھا عمل بتایا گیا۔ صوفیائے کرام میں ایک اہم نام حضرت شیخ فریدالدین گنج شکر (۱۲۶۵-۱۱۷۳) کا بھی ہے جو بارہویں صدی کے اواخر اور تیرہویں صدی عیسوی کے ابتدائی دور میں ہمارے ملک کے ایک عظیم صوفی تھے۔ ان کی طبیعت اور حسن سلوک کا ایک واقعہ مشہور ہے کہ ایک بار چار درویش آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کے ساتھ بدسلوکی کی اور سخت لہجہ میں بات کی۔ حضرت گنج شکر نے پھر بھی ان کی دلجوئی کی اور مہمان نوازی کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ جب وہ لوگ جانے لگے تو بابا نے انہیں جنگل کے راستے سے جانے کو منع کیا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ راستے میں خطرہ ہے۔ وہ چہار درویش پھر بھی نہ رکے اور چلے گئے۔ ان کے جانے پر حضرت بابا فرید بہت روئے اور ہچکیاں بندھ گئیں۔ بعد میں پتہ چلا کہ جنگل میں زوروں کی آندھی آئی اور وہ چاروں درویش ہلاک ہو گئے۔ اس طرح کی ایک دو نہیں بلکہ سیکڑوں مثالیں ہیں جو تاریخ کے دامن میں محفوظ ہیں اور ہم میں سے ہر کسی کو اس بات کو پورا حق ہے کہ واقعات کے دامن میں پھیلے ہوئے حسن سلوک کے ان پھولوں کی خوشبو کو اپنے اندر بھی جذب کر لے تا کہ حسن سلوک سے نہ صرف خدا کی نظروں میں پیارے بنیں بلکہ دنیا والوں کے نزدیک بھی لائق احترام کہلائیں۔ حسن سلوک نبیوں، بزرگوں، ولیوں اور نیک لوگوں کا خاص شیوہ رہا ہے۔ اس عادت کو لوگ بلا تفریق مذہب و ملت اگر اپنا لیں تو یقین مانئے دنیا سے بہت حد تک برائی کا خاتمہ ہو جائے گا اور دنیا میں امن اور انسان دوستی کا بول بالا ہو جائے گا۔

❖❖❖

Dr. Mahnaaz Anwar
529/897A, Panchvati Colony
Rahim Nagar, Lucknow-226006
Mob.6393456500

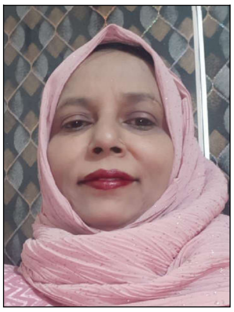

غزل

ہم اپنی ذات نہ اپنے حصار سے نکلے
کبھی جو نکلے بہت بیقرار سے نکلے

زمانہ بیت گیا کوئے یار سے نکلے
تصورات نہ تیرے دیار سے نکلے

زباں پہ نام کے آتے ہی لڑکھڑائے قدم
پتا چلا کہ نہ اب تک خمار سے نکلے

ہماری آبلہ پائی میں بھی نہ تھی تاثیر
تڑپتے جلتے ہوئے پُرغبار سے نکلے

تھے مضطرب کہ سفر پر تھی تیرگی غالب
ہوئے جو خوگرِ نالاں ضرار سے نکلے

یہ جانتے ہیں کہ اک دن جہاں سے جانا ہے
یہ جان کر بھی نہ ہم اس قمار سے نکلے

عجیب درد بھری داستاں رہی زرینؔ
سنانے بیٹھے تو قصے قطار سے نکلے

ڈاکٹر زرینہ بیگم زرین

Dr.Zarina Begam
Associat Professor, Dept of Urdu
Hamidiya Girls P.G.College,
Prayagraj
Mob.7007400501

غزل

کرتا میں کیسے عشق پھر انجام پوچھ کر
جب چیز کوئی لیتا نہیں دام پوچھ کر

بولا تھا صبح اس کے تعلق سے پوچھنا
مشکل بڑھا دی تم نے سرِشام پوچھ کر

کتنا وہ ہوچکا ہے مرے غم سے آشنا
بھرتا نہیں ہے ساقی مرا جام پوچھ کر

سب کو ہمیشہ مجھ سے شکایت یہی رہی
کرتا نہیں ہوں کیوں میں کوئی کام پوچھ کر

دس بیس خود بتاتے دلیلوں کے ساتھ ہم
تم ایک بھی لگاتے جو الزام پوچھ کر

اجرت تو دے ہی دی ہے تجھے کام کی عطاؔ
اب کیا کرے گا کوئی تیرا نام پوچھ کر

عامر عطا

Aamir Ata
T-248, Bara Bagan Lane
P.O. Bartala, P. S. Raja Bagan
Kolkata-700018
Mob.8100460148
aamirata007@gmail.com

ڈاکٹر سعید احمد سندیلوی

زبان کی توسیع کے ذرائع

اصل میں کوئی زبان اپنے آپ(Automatically) وسیع اور مالدار (Rich) یا عالمی زبان (Internatioal Language) نہیں بن جاتی۔ بلکہ اس زبان کے وسیع اور مالدار (Rich) ہونے کے اسباب ہوا کرتے ہیں۔ میری نظر میں، کسی بھی زبان کے وسیع اور مالدار ہونے کے پانچ خاص ذرائع تعلیم، تخلیق، ترجمہ، صحافت اور تنقید ہیں۔ اب ہم ان سبھی ذرائع پر علاحدہ علاحدہ روشنی ڈالیں گے۔

۱- **تعلیم**:-

کسی بھی زبان کے فروغ، ترقی و توسیع کے لئے ضروری ہے کہ اس زبان کی ابتدائی تعلیم سے لے کر اعلیٰ تعلیم دئے جانے کے ادارے قائم ہوں۔ ان اداروں میں زبان سے ناواقف اور نابلد لوگوں کو زبان کی واقفیت حاصل کرنے کی بھرپور سہولیات حاصل ہوں۔ زبان کے فروغ کے لئے لازمی ہے زبان کی تعلیم کے ہر سطح کے تعلیم کے ذرائع موجود ہوں۔ مکانی لحاظ سے زبان کی تعلیم سیکھنے کے ادارے گاؤں، قصبات اور بڑے شہروں تک میں موجود ہوں۔ ابتدائی اور وسطی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بھی ادارے وافر تعداد میں موجود ہوں جن کی سرپرستی حکومت کے ذمہ ہونا چاہیے۔ اعلیٰ تعلیم کے ادارے سے مراد زبان کی تحقیق و تنظیم تک کی ہے۔ لوگ اس زبان میں تحقیق کر رہے ہوں۔ پوشیدہ گوشے بھی تلاش کئے جا رہے ہوں۔

۲- **تخلیق** :-

کسی بھی زبان کے ترقی یافتہ ہونے کا دارومدار اس میں تخلیقی صلاحیت(Capacity) پر منحصر ہے۔ جس زبان میں جتنا زیادہ تخلیقی کام ہو رہا ہوگا وہ زبان اتنی ہی زیادہ متمول (Rich) ہوگی۔ یہ تخلیقات نثری بھی ہوسکتی ہیں اور شاعری میں بھی۔ ویسے کسی بھی زبان کی توسیع نثر سے ہوتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو میں شاعری بہت زیادہ ہو رہی ہے لیکن زبان کی توسیع نہیں ہو رہی ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ صرف ادب کی بھرمار سے بھی زبان کی توسیع ممکن نہیں۔ ادب کے پڑھنے والوں کی تعداد محدود اور مخصوص ہوا کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر شخص ادب پڑھنا پسند نہیں کرتا۔ بلکہ غیر ادبی مواد کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ اہل اردو نے یقیناً اردو ادب کے تعلق سے قابل ستائش خدمات انجام دی ہیں۔ زبان کے فروغ اور توسیع کیلئے ناگزیر

ہے کہ اس میں مختلف موضوعات اور عنوانات پر کثرت سے لکھا جا رہا ہو۔ تخلیقی مواد کو فروغ دینے کا ایک اہم ذریعہ مضمون نگاری ہے۔ مضمون نگاری کے فروغ کے لئے ضروری ہے کہ مختلف موضوعات پر مضامین لکھائے جائیں۔ اچھے اور اعلیٰ (ٹاپرس) مضمون نگار کو انعامات (اول، دوم اور سوم) سے نوازا جائے۔ ہو سکتا ہے آج کا مبتدی مضمون نگار مستقبل کا عالمی مضمون نگار بن جائے۔ یہاں یہ واضح کرنا اشد ضروری ہے کہ شاعری سے زبان کی توسیع نہیں ہوتی بلکہ ادب پروان چڑھتا ہے۔ زبان کے توسیع کے لئے ضروری ہے نثر کو فروغ ملے۔ ویسے بھی دیکھنے میں آ رہا ہے کہ جو شاعر اردو لکھ تک نہیں پاتا وہ شعر کیا خاک کہتا ہوگا۔ اوریجنل شاعری کو فروغ دینے کے لئے لازمی ہے کہ مصرع طرح پر ہی مشاعروں کا انعقاد کیا جائے اس سے متشاعر اور گویّے بنکروں میں چلے جائیں گے اور اسٹیج پر صرف اور صرف اصلی اور اوریجنل شاعر ہی بچیں گے جو یقیناً کافی کم ہیں۔

۳- ترجمہ:-

میری نظر میں کسی بھی زبان کے مالدار (Rich) ہونے کے لئے لازمی ہے کہ اس زبان کے تخلیق کار دیگر زبانوں سے بھی واقف ہوں اور ان کا مطالعہ کرنے کے ساتھ ساتھ دوسری زبانوں کے پسندیدہ مواد کو اپنی زبان میں ترجمہ (بمعنی منتقل) بھی کر رہے ہوں۔ دیگر زبانوں سے ترجمہ سے جہاں ایک طرف اپنی زبان کی توسیع ہوتی ہے وہیں دوسری جانب یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دیگر زبانوں میں کیا لکھا جا رہا ہے، کیسا لکھا جا رہا ہے اور کیوں لکھا جا رہا ہے۔ ترجمہ سے دوسری زبان والوں کے خیالات اور تجربات سے واقفیت اور استفادہ کا موقع ملتا ہے جو یقیناً قاری اور اہل زبان کو وسیع النظر بننے میں معاون اور مددگار ثابت ہوتا ہے۔ بلکہ اصل (اوریجنل) زبان والے بیک وقت دوسروں کے خیالات ونظریات سے واقف اور شناسا ہو جاتے ہیں اور اپنی زبان والوں کا معیار و مرتبہ پہچاننے اور جاننے کے لائق ہو جاتے ہیں۔ اس لئے یہ انتہائی ضروری ہے کہ اپنی زبان کو مضبوط، مستحکم اور وسیع کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ دوسری زبانوں کا ترجمہ بھی کیا جائے۔ اسی ترجمہ کی بدولت آج ہم انگریزوں کے تحریر کردہ قانون اور میڈیکل کی کتابوں سے واقف ہو سکے ہیں۔ اگر قانون کی کتابوں کا ترجمہ ہندی میں نہ ہوتا تو شاید آج کے موجودہ وکیلوں میں چالیس فیصد وکیلوں کا وجود ہی نہ ہوتا۔ کیونکہ اکثریت ایسے وکیلوں کی ہے جو انگلش میں انتہائی کمزور ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کے وکلا .L.L.B ہی نہ کر پاتے۔ جب قانون کی تعلیم نہ لے پاتے تو وکیل بننے کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ مختصر یہ کہ کسی بھی زبان کے توسیع میں ترجمہ کا اہم کردار ہوا کرتا ہے۔

ترجمہ کے فروغ میں اکادمیاں اہم کردار ادا کرسکتی ہیں۔ ملک کی ہر اردو اکادمی کو چاہیے کہ اپنے وہاں ایک شعبۂ ترجمہ قائم کرے اور اس کے تحت علاقائی، صوبائی یا پھر کسی عالمی زبان (عربی، انگریزی، اسپینش، فرنچ، چینی یا روسی وغیرہ) سے اردو میں ترجمہ کرائیں۔ بہتر تو یہ ہے کہ ہر اردو اکادمی اپنے یہاں ایک ٹرانسلیشن سینٹر (مرکز ترجمہ) کا لازمی قیام کرے اور اس سینٹر میں دوسری زبان سے اردو میں منتقل کرنے کی تربیت دے۔ یہ کورس کم سے کم چھ ماہ اور زیادہ سے زیادہ دو سال کی مدت پر مبنی ہونا چاہیے۔ مثلاً ہندی سے اردو میں ترجمہ کرنے کا کورس۔ یہ کورس ان صوبوں میں چھ ماہ کا کافی ہوگا جہاں ہندوستانی (یعنی اردو اور ہندی) بولی جاتی ہے۔ غیر ملکی زبان سے اردو میں ترجمہ کا کورس دو سالہ مدت سے کم قطعی نہ ہونا چاہئے۔ یہ تو ٹرانسلیشن سینٹر کے قیام سے متعلق بات ہوئی۔ اسی

طرح ملکی زبانوں میں مراٹھی سے اردو، بنگلہ سے اردو، تیلگو سے اردو، ملیالم سے اردو، کنڑ سے اردو وغیرہ کے ترجمہ سکھانے کے مراکز قائم کئے جاسکتے ہیں اور ترجمہ کی تربیت دی جاسکتی ہے۔ ترجمہ کی تربیت دینے سے قبل لازمی ہوگا کہ دیگر زبان کی اردو میں لغت تیار کرائی جائیں۔ انگلش سے اردو میں لغت بہت پہلے سے موجود ہیں۔ دوسری زبانوں کا مجھے علم نہیں۔

۴- **صحافت**:-

موجودہ دور میں صحافت کی اہمیت کو کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ کسی بھی زبان کی توسیع میں صحافت کا اہم رول ہوا کرتا ہے۔ زبان کی توسیع کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس زبان میں اخبارات، رسائل و جرائد نکل رہے ہوں۔ واضح ہو کہ عوام الناس ادب سے کم صحافت سے زیادہ وابستہ رہتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ایک شخص ناول یا افسانے نہ پڑھتا ہو لیکن اخبار پڑھنے کا پابند ہو۔ صحافیانہ مواد عوام الناس کے درمیان پڑھا جاتا ہے جبکہ ادب خواص کے درمیان کی چیز ہے۔

تقریباً آج سے چالیس سال قبل بلکہ میرے بچپن میں دورانِ سفر لوگ اخبارات، رسائل و جرائد وغیرہ پڑھتے رہتے تھے۔ انٹرنیٹ اور موبائل کے آجانے سے اب ۹۰ فیصد لوگوں کے ہاتھوں میں موبائل سیٹ نظر آنے لگا ہے اور اس میں لوگ You Tube وغیرہ پر مصروف نظر آتے ہیں۔ اس طرح اخبار بینی میں کافی کمی آگئی ہے۔ مطالعہ میں کمی کے اثرات مصنفین پر پڑنا لازمی ہیں۔ مطالعہ کے بغیر کوئی شخص لکھ نہیں سکتا۔ مطالعہ خواہ کتب کا ہو یا غیر کتب، اخبارات، رسائل و جرائد وغیرہ کا قوت تحریر میں معاون و مددگار ہوتا ہے کیونکہ مطالعہ سے ہی قوت تحریر پیدا ہوتی ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ اس وقت تک کوئی اچھا، مؤثر اور نافع مقرر نہیں ہوسکتا جب تک وہ روزانہ پابندی سے مطالعہ نہ کرتا ہو۔ بغیر مطالعہ والا مقرر اپنے آپ کو اور اپنی تقریر کو دوہرانے لگتا ہے۔ اس کے برعکس مطالعہ کا پابند مقرر یا مصنف تازہ مواد سامعین کے سامنے پیش کرنے کے قابل اور اہل ہوتا ہے۔

بعض انگریز صحافیوں نے تحریر کیا ہے کہ انہوں نے اخبار بینی سے مضمون نگاری کی شروعات کی۔ اخبارات پڑھتے پڑھتے انہیں لکھنے کا شوق پیدا ہوا اور انھوں نے لکھنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ وہ مضمون نگاری کرنے لگے اور ایک دن پختہ مضمون نگار بن گئے۔ اخبار بینی کے فقدان یا کمی سے نقصان یہ ہوسکتا ہے کہ مستقبل بعید میں تخلیق کاروں اور اہل قلم صاحبان کی تعداد میں کمی آجائے۔ ویسے بھی موبائل کے استعمال سے ناول اور افسانوں کے پڑھنے والوں میں کمی آئی ہے۔

۵- **تنقید**:-

کسی بھی زبان کے فروغ اور توسیع کے لئے لازمی ہے کہ اس زبان میں تنقیدی مضامین بھی قلم بند کئے جارہے ہوں۔ اس سے پہلی بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ جس زبان میں تنقید کی گئی ہے اس میں تخلیق کا عمل جاری ہے نیز تخلیق کردہ مواد پڑھا اور اس میں غور وفکر کیا جارہا ہے۔ اس طرح تنقید بھی زبان کے فروغ اور توسیع کا ذریعہ بنتی ہے۔

مختصراً، کسی بھی زبان کے فروغ اور توسیع کے لئے یہ لازمی ہے کہ زبان کے پروان چڑھنے والے تمام ذرائع کو فروغ ملے۔ لہٰذا، یہ بھی اشد ضروری ہے کہ ایسا مواد تخلیق کیا جائے جسے پڑھنے کے لئے لوگ مجبور ہوجائیں۔ جب پڑھا جائے گا تبھی لکھا بھی جائے جس سے یقیناً زبان کی توسیع ہوگی۔

❖❖❖

Dr. Saeed Sandelvi
435/330, Thakur Ganj
Lucknow-226003
Mob.9455551607

غزل

جفا سے تُم نے سدا جلایا، وفا کی بارش کبھی نہیں کی
تمہاری چاہت میں آج تک میں نے پھر بھی کوئی کمی نہیں کی

تمہارے بخشے ہوئے غموں کو سمجھ کے دولت چھپایا دل میں
رکھی ہمیشہ ہنسی لبوں پر اور آنکھ بھی شبنمی نہیں کی

میں دوں کسے دوش یہ مقدر میں ہی لکھا تھا جو میری کشتی
خوشی کے ساحل تلک نہ پہنچی، عبورِ غم کی ندی نہیں کی

کسی کی فرقت نے شہرِ دل میں رکھا ہمیشہ خزاں کا موسم
جدائی کے آنسوؤں کی بارش نے شاخ اک بھی ہری نہیں کی

مجھے تمہارے خلوص نے کر دیا ہے بے اختیار ورنہ
کبھی کسی اجنبی سے میں نے یوں برملا دوستی نہیں کی

ہوئی سخن پر بھی گفتگو اور ادھر ادھر کی ہزاروں باتیں
مگر جو اک بات دل کی کرنی تھی ان سے ازکیٰ وہی نہیں کی

فوزیہ اختر ازکیٰ

Fauzia Akhtar Azka
C/O Md. Shahid Iqbhal
8-B, Dent mission road
1st Floor, Khidderpur
Kolkata-700023
Mob.9163247925

غزل

سوال ہی نہیں ہر پل غزل کہی جائے
بھلا کہاں سے مسلسل غزل کہی جائے

یہ سوچتے ہوئے اک عمر ہوگئی میری
کبھی تو کوئی مکمل غزل کہی جائے

خدا کرے نہ کسی کے بھی پاؤں زخمی ہوں
بچھا کے کانٹوں پہ مخمل غزل کہی جائے

ہوں لفظیات بھی فن بھی ہو اور نگارش بھی
میں چاہتا ہوں مدلل غزل کہی جائے

جو دل کی بات ہے شعروں میں وہ ابھرتی ہے
ہے مسئلوں کا یہی حل غزل کہی جائے

غزل کے واسطے فن کو نچوڑنا ہوگا
مچادے فکر میں ہلچل غزل کہی جائے

نئے زمانے کے رضواںؔ نئے تقاضے ہیں
جدید دور ہے سوشل غزل کہی جائے

رضوان احمد فاروقی

Rizwan AHmad Farooqi
Danish Mahal, Aminabad
Lucknow
Mob.5948594072

ڈاکٹر عبدالغفار فاروقی

افسانہ

انسانیت

شدید بارش اور بادلوں کی گڑگڑاہٹ کے ساتھ اولوں نے بھی ایک قیامت برپا کر رکھی تھی۔

اقرب کے گیسٹ روم کی باہری کھڑکی کھلی ہوئی تھی ....یہ سوچ کر کہیں بارش کی قہر برساتی نمی کھڑکی کے لکڑی کے پلوں کو اینٹھا نہ دے! لاؤ اس کو بند کر دیا جائے- کھڑکی بند کر ہی رہا تھا کہ اچانک اس کی نگاہ باہر کی طرف اٹھ جاتی ہے وہ یہ دیکھ کر سہم جاتا ہے کہ ایک نہایت حسین غزالی آنکھوں والی دوشیزہ اس کے مکان کے چھجے کے نیچے اس قہر آلود بارش سے بچنے کے لیے لگ بھگ پوری طرح سے بھیگی اور تھر تھر کانپتی ہوئی بالکل دیوار سے چپکی کھڑی ہے۔ چھجے کا سائبان بھی اس موسلا دھار بارش کی بوچھاروں سے شکست فاش کھا کر اس کی کوئی مدد نہیں کر رہا ہے..........لڑکی کی پیشانی پر بہتا ہوا چندن کا تلک یہ احساس کرا رہا ہے کہ یہ کسی مندر سے پوجا کر کے آئی ہے۔

اقرب نے کھڑکی تو بند کر دی مگر نفس کی عیاری اور جان کی زیاں کی ذمہ داری کے احساس سے وہ وہیں ساکت کھڑا ہو کر سوچنے لگا..........اس نو آبادیاتی علاقے میں اکا دکا مکان اور درختوں کی اکثریت کے ساتھ اس نیم پختہ سڑک کے سینے پر موجود چھوٹے چھوٹے تالاب نما بڑے بڑے گڈھوں کی موجودگی میں ایک تو کسی نے باہر چھجا نکالنا مناسب ہی نہیں سمجھا تھا۔ اور مشرا جی و خالد چچا نے نکالا بھی تو اس کو بعد میں دیوار اٹھا کر گارڈن یا پورچ کی حیثیت سے اپنے دولت کدے میں محفوظ کر لیا..........

ابتدائی جنوری کے ایام میں جسم کو یخ کر دینے والی سرد ہواؤں اور نقطۂ انجماد سے نیچے پہنچانے والی بارش اور اولوں کی موجودگی میں وہ اس قومی بہن کی کیسے مدد نہ کرے؟

اقرب کے والد ارسلان سرکاری کام کاج سے دہلی میں موجود تھے، والدہ ارم و بہن شیریں ماموں کے یہاں ممانی کی عیادت کے سلسلے میں گئی ہوئی تھیں..........

اس نے عہد کر رکھا تھا کہ وہ انٹر کے بعد پہلی ہی کوشش میں اچھی رینک سے نیٹ کا امتحان پاس کر کے ڈاکٹر بنے گا اسی لیے پڑھائی کی وجہ سے وہ گھر میں اکیلا ہی رکا تھا..........

اکیلے پن اور شیطان کی شاطرانہ حرکات کے پیش نظر وہ اس حدیث پر غور کر رہا تھا کہ جہاں ایک نامحرم مرد اور عورت ہوتے ہیں وہاں تیسرا شیطان ہوتا ہے۔ وہیں دوسری طرف وہ اللہ کے اس حکم کی گرج بھی سن رہا تھا کہ کسی مجبور کی جان بچانا فرض عین ہے۔ اسی غور وفکر میں اس نے اچانک اپنے گیسٹ روم

کے باہری دروازے کی سٹکنی کھولی اور جلدی سے وارڈ روب کھول کر اپنی بہن شیریں کا ایک نیا سلا گرم سوٹ، جا کیٹ اور تولیہ گیسٹ روم میں رکھتے ہوئے صدر دروازے سے باہر نکلا..........

نگاہ کو نیچے کر کے کہنے لگا بہن میرے اللہ کا حکم ہے کہ مجبور کی جان کی حفاظت اپنی کوشش بھر کی جائے۔ اسی نے ہم کو پیدا کیا اور گھر بار دولت سب کچھ عطا کیا ہے اس لیے اس کا حکم ہم کو ماننا ضروری ہے اس وقت اگر آپ یہاں کچھ دیر اور کھڑی رہیں تو ضرور ہی ٹھنڈ کی وجہ سے گر کر مر سکتی ہیں اس لیے آپ میرے گیسٹ روم میں چلی جایئے اور چونکہ میں گھر میں اکیلا ہوں اس لیے آپ انٹرنس اور روڈ دونوں دروازے بند کر لیجئے میں نے بہن کے کپڑے و تولیہ اندر رکھ دیا ہے اسی کے ساتھ روم ہیٹر بھی رکھا ہوا ہے اس کو آن کر کے اپنے کپڑے سکھا لیجئے گا اور بارش رکتے ہی اپنے گھر چلی جایئے گا۔

پوجا کے لیے یہ وقت بڑی کشمکش کا تھا۔ ایک طرف تو سرد ہواؤں اور موسلا دھار بارش نے اس کے جسم کو لگ بھگ سن کر دیا تھا اور سانس بھی کافی تیز ہوگئی تھی دوسری طرف ابھی اس کا گھر یہاں سے ایک کلومیٹر کے قریب دور تھا اور راستے میں کوئی مدد ملنے کی امید بھی نہ تھی۔ یہاں سے گھر تک ایسی حالت میں جانا اس کے لیے ممکن نہ تھا.......... اس نے دل میں کہا ہے بھگوان ! میری حالت کو دیکھ اور میری حفاظت کر..........

پھر وہ اقرب کے گیسٹ روم میں چلی گئی۔ اپنی طاقت بھر عجلت سے کمرے کے دونوں دروازے لاک کیے، دیوان پر رکھی تولیہ سے اپنے ہاتھ پوچھ کر روم ہیٹر آن کیا اور سیدھے اس کے پاس بیٹھ کر اپنے گیلے کپڑوں کو تولیے سے سکھانے لگی۔ مگر باہر بارش کا مقابلہ کر کے بھیگے ہوئے کپڑے سوکھنے کا نام نہیں لے رہے تھے بلکہ وہ ایک سیل رواں کی طرح ہیٹر کی تپش کو جسم تک پہنچنے میں ایک عظیم رکاوٹ بنے ہوئے تھے۔ اس لیے اس کے جسم کی کپکپاہٹ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی..........

حفظ ما تقدم کے تحت پوجا نے کمرے کے چاروں طرف ایک دوربین نگاہ دوڑائی اور اطمینان حاصل کیا کہ کہیں کوئی کیمرہ وغیرہ تو نہیں لگا ہے یا کوئی جھروکا، کھڑکی، دروازہ وغیرہ کھلا تو نہیں ہے پھر تولیے سے اپنے جسم کو اچھی طرح ڈھک کر بیٹھے، بیٹھے ہی اپنے گیلے کپڑوں کو شیریں کے کپڑوں سے بدلنا شروع کر دیا..........

کپڑے تبدیل ہونے کے بعد ہیٹر کی گرمی کو فتح نصیب ہوئی اور پوجا کے لرزتے جسم نے سکوت اختیار کیا..........

جسم کو راحت ملتے ہی وہ ماں کی بیماری اور گھر کی دوری کی فکر میں مبتلا سوچنے لگی کہ گھر سے نکلتے وقت موسم تو خراب تھا مگر ماں جی کو اچانک تیز بخار کے گھیر لینے کی وجہ سے ان کو دوا کی فوری ضرورت تھی، گاؤں میں کوئی قاعدے کا ڈاکٹر نہ تھا، دوسرے جو جھولا چھاپ ڈاکٹر تھے وہ لوٹتے بھی بہت تھے، اس کے ساتھ اس کے گھر کی مالی حالت بھی ٹھیک نہ تھی، اس لیے اس نے گھر سے ڈیڑھ کلومیٹر دور بڑے چوراہے پر حیات چیریٹیبل ہاسپٹل سے دوا لانے کا فیصلہ کیا۔ یہاں ۱۰ روپے کے پرچے پر دو ہفتے تک دوا مفت ملتی تھی۔

موجودہ وقت میں پوجا کا گھر ماں ساوتری بڑا بھائی لیش اور وہ خود تین افراد پر مشتمل تھا۔ والد گھنشیام پانچ سال قبل راہی ملک عدم ہو گئے تھے۔ بڑی بہن اوشا کی شادی وہ اپنی زندگی میں ہی کر گئے تھے اور جو کچھ جمع پونجی تھی وہ اس شادی میں زمانے کے

رسم ورواج کی بھینٹ چڑھا گئے تھے...........

بھائی لیش آری دردوزی کا کام کرتا تھا مگر عالمی بے روز گاری و دیگر مسائل کی وجہ سے تمام کاروبار کے ساتھ یہ کاروبار بھی چوپٹ ہو گیا تھا۔اس کی وجہ سے لیش بھی بے روزگار ہو گیا تھا۔ بے روزگاری کی اس مار نے اس کو بے راہ کر دیا۔ وہ یاردوستوں کے ساتھ آوارہ گھوما کرتا۔ پینے پلانے کا شوق بھی پال لیا تھا۔اس لیے گھر کے اخراجات کی ذمہ داری والد کی ایک بیگھا زمین اور ماں واس کے کاندھوں پر تھی۔ یہ لوگ چکن اور کامدانی سے کچھ آمدنی کرتے اور کچھ اناج کھیت سے آجاتا جس سے ان کی زندگی کا پہیہ غربت کی پٹری پر سسک سسک کر چل رہا تھا۔ایسے میں مہنگا علاج ممکن نہ تھا اس لیے اس نے خود گھر سے حیات ہاسپٹل جانے کا فیصلہ کیا...........

دوا لے کر راستے کے بڑے مندر میں درشن کرنے کے بعد وہ اپنے گھر کی طرف جارہی تھی کہ جاڑے کی بارش نے اس کو گھیر لیا اور پھر وہ اقرب کے چھجے کے سائبان کے سہارے اپنے کو محفوظ کرنے کی کوشش کرنے لگی...........

پوجا ابھی اپنی غربت اور کسمپرسی پر غور وفکر کر رہی تھی کہ گیسٹ روم کے داخلی دروازے پر دستک ہوئی۔اس نے جب اپنی ساعتوں کو یکجا کر کے اس طرف دیکھا تو دستک اس کے موجودہ کمرے کی ہی تھی...........

گھبراتے ہوئے جب اس نے دروازہ کھولا تو دیکھا اس کا محسن اقرب ٹرے میں ایک کیتلی اور دو کپ لیے کھڑا کہہ رہا ہے بہن ٹھنڈ بہت ہو رہی ہے اور آپ تو بھیگ بھی چکی ہیں اس لیے میں نے کافی بنائی ہے اگر آپ مناسب سمجھیں تو پی لیں یہ کہہ کر اس نے ایک کپ میں کافی انڈیل کر ٹرے دروازے کے اندر رکھ کر کہا میں نے آپ کے سامنے اسی کیتلی سے اپنے لیے بھی کافی انڈیل کر پی لی تا کہ آپ کو کسی خطرے کا احساس نہ ہو...........

دروازہ آپ اندر سے دوبارہ لاک کر لیجیے بارش دھیمی پڑ رہی ہے،رک جائے تو گھر چلی جایئے گا...........

پوجا اپنے محسن کے انداز گفتگو سے متاثر تو بہت تھی اور اس کو اس وقت گرم مشروب کی خواہش بھی تھی مگر آج کل روز طرح طرح کے غیر مہذب واقعات ہوتے رہتے ہیں اس لیے احتیاط کے دامن کو مدنظر رکھتے ہوئے اس نے کافی نہ پینے کا فیصلہ کیا اور سڑک کی طرف کھڑکی کھول کر دیکھی تو بارش لگ بھگ رک چکی تھی پھر اس نے اپنے گیلے کپڑوں کو چھو کر دیکھا جن کے اوپر ہیٹر کی گرمی کا کوئی معقول اثر دکھ نہیں رہا تھا...........

پوجا کو گھر جلد سے جلد پہنچنا تھا اس لیے اس نے ایک مضبوط فیصلہ کرتے ہوئے داخلی دروازہ کھولا اور بھیا کہہ کر آواز لگائی اقرب فوراً اسٹڈی روم سے گیسٹ روم کی طرف پہنچا۔ پوجا نے کہا بھیا میری ممی کی طبیعت بہت خراب ہے، مجھے دوا ترنت گھر پہنچانا ہے میرے کپڑے ابھی سوکھے نہیں ہیں، میں آپ کی بہن کے کپڑے پہن کر جارہی ہوں، جلد ہی دھو کر واپس کر دوں گی۔اقرب نے یہ سن کر کہا بہن یہ کپڑے آپ واپس کرنے نہ آیئے گا۔اگر مناسب سمجھیے گا تو اپنی بہن کے کپڑے سمجھ کر پہن لیں ورنہ کسی ضرورت مند کو دے دیجئے گا...........

پوجا نے کمرے میں پڑی پالیتھین کو اقرب سے مانگ کر اپنے گیلے کپڑوں کو اس میں رکھا اور گیسٹ روم سے باہر نکل آئی...........

بارش ابھی تھمی تھی اس لیے سڑک کا زیادہ تر حصہ پانی سے لبریز تھا مگر ممی کی بیماری نے اس کو اسی پانی میں چلنے کے لیے مجبور

کیا...........

پوجا تیز قدموں سے چل کر گھر پہنچی ساوتری کا بخار شدت اختیار کر چکا تھا، جلدی سے اس نے کچن میں پہنچ کر پانی کو نیم گرم کیا اور ڈبے سے بسکٹ نکال کر ماں کے پاس پہنچی، ماں کو اٹھا کر ایک بسکٹ کھلایا پھر دوا دے کر بستر دراز کر دیا...........

گھر کے ضروری کام نپٹانے کے بعد جیسے ہی اقرب کے دیے ہوئے کپڑوں کو بدلنے کے لئے پوجا نے کوٹھری میں قدم رکھا تھا کہ ساوتری کو اپنی طبیعت میں افاقہ محسوس ہوا اور انہوں نے آنکھیں کھولیں تو پوجا کو اپنے پاس نہ دیکھ کر آواز دے کر پانی مانگا۔ پوجا نیم گرم پانی ماں کو پلا کر اپنا روداد سفر سنا ہی رہی تھی کہ بھائی لیش مٹر گشتی اور اپنے لوفر دوستوں کے ساتھ وقت کا زیاں کر کے گھر لوٹا تو اس نے اقرب کے دیے ہوئے کپڑے پہنے ہونے کی بات سن لی...........

لیش آگ بگولا ہو گیا اور ایک زوردار طمانچہ پوجا کو رسید کیا۔ کہنے لگا ''اب تو یہ سب بھی کرے گی؟ دوسروں کے گھر جا کر راس لیلا (عیاشی) کر کے کپڑے گفٹ لے گی؟''

پوجا کا لیش کے زوردار طمانچے اور اس سے زیادہ اس کے الفاظ سن کر سر چکرانے لگا۔ وہ روتے ہوئے بولی میں ممی کو اس طرح کیسے بخار میں تڑپتے ہوئے دیکھتی رہتی۔ یہ آپ کی ذمہ داری تھی مگر آپ کے پاس تو وقت ہی نہیں اپنے لوفر دوستوں کے ساتھ گھومنے اور لوفر ٹی کرنے سے۔کوئی کام کاج تو آپ کرتے نہیں ہیں بس ہماری محنت کی کمائی برباد کرتے رہتے ہیں۔آپ کو تو دکھ ہونا چاہیے تھا کہ میری بہن نے میرے ہوتے ہوئے اتنی مصیبت جھیلی...........

لیش کو پوجا کے الفاظ ہتھوڑے سے زیادہ بھاری لگے اور مارے غصے کے وہ ہاتھ پیر پٹخنے لگا...........

مگر اسی بیچ ساوتری نے اپنی بیمار آواز میں کہا بیٹا یہ تم کیا کر رہے ہو، اگر پوجا دوائی نہ لاتی تو میں مر جاتی۔صبح تو تم دیکھ کر گئے تھے کہ میں بیمار تھی مگر اس کے بعد بھی تم بیکاری کرنے چلے گئے اور میری دوائی کی فکر نہیں کی...........

ماں کی ممتا اور بہن کے آنسوؤں کو دیکھ کر لیش بہت شرمندہ ہوا اور برآمدے میں جا کر خاموشی سے بیٹھ گیا...........

> پوجا نیم گرم پانی ماں کو پلا کر اپنا روداد سفر سنا ہی رہی تھی کہ بھائی لیش مٹر گشتی اور اپنے لوفر دوستوں کے ساتھ وقت کا زیاں کر کے گھر لوٹا تو اس نے اقرب کے دیے ہوئے کپڑے پہنے ہونے کی بات سن لی...........

لیش بیٹھے ہوئے سوچ رہا تھا یہ سچ ہے کہ اپنے پریوار کے خرچ اور دوسرے کاموں کی ذمہ داری میری ہے مگر میں خود الٹا ان پر بوجھ بنا ہوا ہوں۔ آہ! بھگوان میں کیا کروں؟ کہیں کوئی کام ملتا ہی نہیں ہے........... اچانک لیش اٹھا اور اس نے فیصلہ کیا میں کلو چچا سے ای رکشا کرائے پر لے کر چلاؤں گا اور اپنے پریوار کی ذمہ داری خود اٹھاؤں گا...........

لیش کے کام کرنے اور بہتر علاج سے ساوتری پوری طرح سے ٹھیک ہو گئیں۔ اس لیے پوجا اور ساوتری اب بہت خوش رہنے لگی تھیں...........

پوجا نے ایک دن ساوتری سے کہا ممی چلیے اقرب کی بہن کے کپڑے واپس کر دیں...........

ماں بیٹی دونوں اقرب کے گھر کپڑے لے کر پہنچیں۔ پوجا

نے ڈور بیل بجائی تو اقرب کی ماں ارم نے دروازہ کھولا۔ دو اجنبی عورتوں کو اپنے سامنے دروازے پر دیکھا۔ اصول مہمان نوازی کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ڈرائنگ روم میں دونوں کو بٹھایا۔ ابتدائی تعارف کے بعد پوجا نے احسان مند نظروں سے اقرب کے دیے ہوئے کپڑوں کو ارم کو واپس کرتے ہوئے کہا آنٹی آپ لوگوں کا بہت بہت دھنیواد، اگر اس دن مجھ کو یہ کپڑے نہ ملتے تو میں صحت مند رہتے ہوئے گھر نہ پہنچ پاتی اور نہ ہی ماتا جی کو صحیح وقت پر دوائی مل پاتی..........

کپڑوں کو دیکھ کر ارم نے کہا بیٹی اللہ نے تم کو ماں کی خدمت سے خوش ہو کر تمہاری مصیبت کے وقت اقرب کو تمہاری مدد کے لیے چنا، اس میں ہم لوگوں کا کوئی احسان نہیں، رہی بات کپڑوں کی واپسی تو ہمارے یہاں بیٹیوں یا بہنوں کو جو چیز دے دی جاتی ہے وہ واپس نہیں لی جاتی، اس لیے یہ کپڑے اب تم کو ہی پہننا پڑیں گے۔

پوجا نے کپڑے واپس بیگ میں رکھے اور اپنے گھر کی طرف چل دی۔ درختوں کی اکثریت کے ساتھ اس نیم پختہ سنسان سڑک پر چلتے ہوئے پوجا یہ سوچ رہی تھی اس برے دور میں بھی بھگوان نے ایسے لوگوں کو زندہ رکھا ہے جن کے یہاں نہ دھرم نہ لنگ (جنس) کا کوئی بھید بھاؤ ہے۔ اور نہ ہی ان کے یہاں انسانیت مری ہے اور اقرب جیسے لوگ ابھی بھی اس دھرتی پر موجود ہیں!!!!!

❖❖❖

Dr. Abdul Ghaffar Farooqi
219/101, Gali Hakeem Basheer,
Patanala, Chawk, Lucknow-03
urduzindabad@gmail.com
Mob.:9415576584

غزل

وہ نار جہنم کی پرچھائیاں ہیں
گناہوں سے حاصل جو رسوائیاں ہیں

برہنہ کیا شاخ گل کس نے آخر
شجر پہ فقط چند ہی پتیاں ہیں

جہاں پائمالی گلوں کی ہوئی ہے
چراغوں سے خالی وہی بستیاں ہیں

سمندر کی فطرت سے ہیں خوف واقف
سمندر کے سینے پہ جو کشتیاں ہیں

یقیناً کوئی ان کے ہم دوش ہوگا
چراغوں سے خائف اگر آندھیاں ہیں

مرے ضبط کی آزمائش ہے تابش
تڑپتی بڑی دیر سے بجلیاں ہیں

طلحہ تابش

Talha Tabish
Sahaudar Pur West
Station Road, Sitaram Gali
Pratapgarh-(UP) Pin-230001
Mob. 9044676517

تبصرہ کے لئے کتاب کے دو نسخے بھیجنا لازمی ہے

خبرنامہ تبصرہ

نام کتاب : علامہ عبدالعزیز رحیم آبادی: حیات وخدمات
مرتب : منظر حسن سلفی
مرتب سے رابطہ: 9820060830
ناشر : جمعیۃ ابنائے دارالعلوم احمدیہ سلفیہ، دربھنگہ، بہار
سال اشاعت : ۲۰۲۴ء
صفحات : ۲۵۶
قیمت : درج نہیں
ملنے کا پتہ : جمعیۃ ابنائے دارالعلوم احمدیہ سلفیہ، دربھنگہ، بہار
مبصر : ذکی نور عظیم ندوی

''علامہ عبدالعزیز رحیم آبادی حیات و خدمات'' جمعیت ابنائے دارالعلوم احمدیہ سلفیہ دربھنگہ بہار کی جانب سے ۷ انومبر ۲۰۲۴ء کو دارالعلوم احمدیہ سلفیہ لہریا سرائے دربھنگہ میں منعقد ہونے والے ایک روزہ دعوتی و تربیتی کانفرنس کیلئے لکھے گئے مقالات کا مجموعہ ہے جس میں ملک و بیرون ملک کے ممتاز اصحاب علم و قلم کے ۲۷/ مقالے اور دو نظمیں ہیں۔

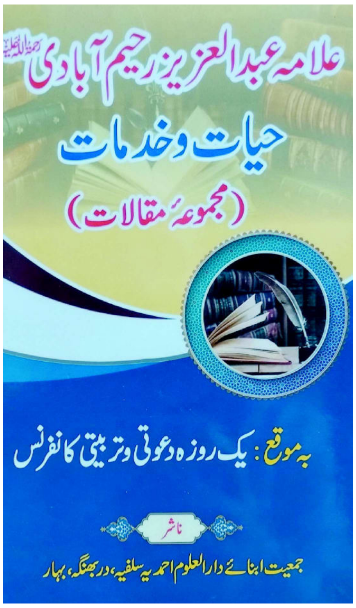

اس مجموعہ میں مقالہ نگاروں نے مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی رحمہ اللہ کی عظمت کو مختلف رنگوں میں پیش کرتے ہوئے ایک طرف ان سے اپنی والہانہ عقیدت ومحبت کا اظہار کیا ہے تو دوسری طرف مولانا کی زندگی کے مختلف گوشوں کو نہایت خوبصورتی سے اجاگر کیا ہے، ان کے اوصاف حمیدہ اور خصائل کریمانہ کا دل نشیں انداز میں تذکرہ ہے تو ساتھ ہی ان بیش بہا نصیحتوں وحکمتوں کو تفصیل سے پیش کیا ہے جن سے موجودہ اور آنے والی نسلیں فیضیاب ہوں گی۔

اس میں کانفرنس کیلئے لکھے گئے مقالات کو بہت حد تک ان کی اصل شکل و صورت میں برقرار رکھا گیا، حالانکہ بعض مقالات میں معمولی حذف و اضافہ سے کام لیا گیا ہے اس کے باوجود بعض جگہ معلومات میں تکرار واضح طور پر محسوس کی جاسکتی ہے۔

برصغیر ہند میں جن عبقری شخصیات نے جنم لیا ان کی فہرست طویل ہے۔ اس میں ایک نمایاں نام علامہ مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی رحمت اللہ علیہ کا بھی ہے۔ وہ جماعت اہل حدیث سے تعلق رکھتے تھے اور بجا طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ سرزمین بہار کے ایک دور افتادہ علاقے رحیم آباد کی زمین سے طلوع ہونے والا یہ ستارہ صرف بہار تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ ملکی افق پر ماہتاب و ماہتاب بن کر چمکنے لگا اور اپنے ایمان کی قوت، علم کی دولت اور عمل کی برکت سے ایک عالم کو مستفید فرمایا اور علم و فضل کے انمٹ نقوش چھوڑے۔

علامہ رحیم آبادی کو اللہ تعالیٰ نے بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ وہ نہایت موقر ومستند عالم دین، میدان دعوت کے عظیم شہ سوار، علوم متداولہ کے بحر زخار، میدان صحافت وخطابت کے آزمودہ کار اور حکم وفیصلے میں پختہ کار تھے۔ اخلاص و وفا کے جو ہر گراں مایہ سے مزین جہاں بینی و جہاں بانی کی بیش تر صفات سے آراستہ اور دور اندیشی و معاملہ فہمی سے لبریز شخصیت کے مالک تھے۔

دارالعلوم احمدیہ سلفیہ دربھنگہ بہار کی تاسیس بھی مولانا رحیم آبادی کے دست مبارک سے ہی ہوئی۔ جب آپ کی صحت اور آرا کے داخلی حالات بگڑنے لگے تو مولانا رحیم آبادی نے آرا کے

مدرسہ کو دربھنگہ منتقل کرنے کا فیصلہ کیا اور زمین خرید کر پہلے ایک جھونپڑی بنائی اور اس کو مدرسہ ودعوتی مرکز کے طور پر استعمال کرنے لگے جو قلیل عرصہ میں ایک ایسے عظیم جامعہ کی شکل اختیار کر گئی جس سے بعد میں پورا ہندوستان منور ہوا۔ اسی طرح ۱۹۰۶ء میں جب آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس کے نام سے تنظیم قائم کرنے کا فیصلہ ہوا اور حافظ عبداللہ غازی پوری اس کے اولین صدر اور مولانا ثناء اللہ امرتسری ناظم اعلیٰ بنائے گئے تو اس کے تعارف کے لئے بنائی گئی تین رکنی کمیٹی میں مولانا رحیم آبادی، مولانا ثناء اللہ امرتسری اور مولانا ابراہیم سیالکوٹی تھے۔ آپ ہی نے سیرۃ النعمان سے پیدا ہونے والی غلط فہمیوں کے ازالہ کے لئے ''حسن البیان فیما فی سیرۃ النعمان'' تصنیف کی اور علم حدیث اور محدثین کے تعلق سے لوگوں کو پوری طرح مطمئن کیا۔ آپ شیخ الکل سید نذیر حسین دہلوی کے ان شاگردوں میں تھے جن کو وہ بڑے قدر کی نگاہ سے دیکھتے اور ان کی علمی و دعوتی کوششوں کی تعریف کرتے تھے۔ درس میں جب کوئی طالب علم کسی مسئلہ کو نہ سمجھ پاتا اور حضرت میاں صاحب اس کو سمجھا کر تنگ آ جاتے تو فرماتے کہ مولوی عبدالعزیز کو بلاؤ وہ اس کو سمجھائے گا۔

ابھی تک مولانا کی حیات و خدمات پر صرف مولانا فضل الرحمٰن سلفی کی تحریر کردہ کتاب ''مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی حیات و خدمات'' ہی تھی، لیکن مذکورہ کانفرنس اور خاص طور پر اس کے مقالات کے مجموعہ سے ان شاء اللہ نئی نسل کو ان سے واقف ہونے کا ایک بہتر وسیلہ مل جائے گا۔

اس مجموعہ میں مولانا رحیم آبادی کے تعلق سے مختلف اہم ترین موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے جن میں ان کی تعلیم وتربیت اور نشونما، ان کا خاندانی اور سیاسی وسماجی پس منظر، ان کے اخلاق وعادات اور معاصرین کے تاثرات، بانی دارالعلوم اور دارالعلوم احمدیہ سلفیہ دربھنگہ، ان کے معالج اور تعلیمی جانشین ڈاکٹر سید محمد فرید، ملی مسائل میں مولانا رحیم آبادی کی مسلمانوں کی قیادت، مناظرہ مرشدآباد، بحیثیت مدرس ومربی، بحیثیت داعی ومبلغ، حسن البیان کا پس منظر، مساجد کی حفاظت میں رحیم آبادی صاحب کا کردار، آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس کے دعوتی مشن کو فروغ دینے میں مولانا رحیم آبادی کا کردار، مولانا رحیم آبادی اور دیگر علمائے اہل حدیث کے روابط، مولانا رحیم آبادی اور دارالحدیث رحمانیہ دہلی کے قیام کا تخیل، نیپال میں مولانا رحیم آبادی کی دینی ودعوتی خدمات، مدرسہ احمدیہ آرا کا قیام اور اس کا انتظام، مولانا رحیم آبادی کا آزادی ہند میں کردار اور مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی اور ان کی شاعری جیسے موضوعات شامل ہیں۔

اس مجموعہ میں مولانا اصغر علی امام مہدی سلفی امیر مرکزی جمعیت اہل حدیث، شیخ محمد علی مدنی امیر جمعیت اہل حدیث بہار، محمد فرقان عبدالعزیز سلفی داعی ریاض سعودی عرب، مولانا اسعد اعظمی جامعہ سلفیہ بنارس، موانا منظر احسن سلفی، ڈاکٹر عبداللہ محمد مشتاق عمری پروفیسر حائل یونیورسٹی سعودی عرب، ڈاکٹر محفوظ الرحمٰن محمد خلیل مدنی کویت، مولانا سعید الرحمٰن سنابلی، مولانا ثنا اللہ صادق تیمی مترجم فوری حرم مکی سعودی عرب، مولانا اشرف فردوسی ندوی، ڈاکٹر محمد شیث ادریس تیمی، مولانا نورالعین سلفی اور ڈاکٹر ظل الرحمٰن تیمی جیسے اصحاب علم وقلم کے مقالات اور دو نظمیں بھی شامل ہیں۔

یہ مجموعہ ۲۴۰ رصفحات پر مشتمل ہے جس کو جمعیت ابنائے دارالعلوم احمدیہ سلفیہ نے انتہائی دیدہ زیب سرورق اور عمدہ طباعت کے ساتھ شائع کیا۔ اس طرح یہ مجموعہ نہ صرف مولانا کے حالات زندگی بلکہ اس عہد کی تعلیمی دعوتی، ملکی اور سماجی صورت حال جاننے و سمجھنے کے لیے ایک اہم مرجع کی حیثیت حاصل کرسکتا ہے۔

❖❖❖

Maulana Zaki Noor Azeem Nadwi
Unique Translation Centre
Shabab Market, Nadwa Road
Lucknow-
Mob-9450652663

علمی و ادبی خبریں

معروف صحافی عالم نقوی کو یاد کیا گیا

لکھنؤ۔معروف صحافی عالم نقوی کی خدمات کو یاد کرتے ہوئے ایک تقریب کا انعقاد عارف آشیانہ چوک، لکھنؤ میں تنظیم 'علی کانگریس' کے تحت کیا گیا۔صدارت معروف صحافی احمد ابراہیم علوی نے کی۔انھوں نے عالم نقوی کی قرآن فہمی اور ادب فہمی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ عالم نقوی نے دولت وشہرت کے لئے صحافت کا میدان نہیں چنا تھا بلکہ ان کی صحافت ایک مقصد اور مشن کے تحت تھی اور وہ مقصد تھا حق کی آواز بلند کرنا۔تنظیم کی صدر روبینہ مرتضٰی نے نظامت کرتے ہوئے کہا کہ کم ہی لوگوں کو اس بات کا علم ہے کہ عالم نقوی علی کانگریس کے صدر بھی رہ چکے ہیں۔وہ 2005 سے 2012 تک اس تنظیم کے صدر رہے۔رضوان احمد فاروقی نے کہا کہ عالم نقوی بہت مخلص انسان تھے۔حق گوئی ان کی خاصیت تھی۔اے ایم یو اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے صدر سید محمد شعیب نے کہا کہ میری پہلی ملاقات کا آغاز ان کے ساتھ ایک سفر سے ہوا۔اس سفر میں ان کے کردار کی خوبیوں اور صفات کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ان کے کردار و گفتار کی یکسانیت نے مجھے بہت متاثر کیا۔انھوں نے عالم نقوی کی تحریر کی روانی اور اس کی ادبیت پر بھی گفتگو کی۔مجاہد سید نے کہا کہ عالم نقوی کو وہ احترام و اکرام نہ مل سکا جس کے وہ بجا طور پر مستحق تھے۔معید رہبر، عبیداللہ ناصر اور امیر مہدی نے بھی اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔معصوم مرادآبادی و ندیم صدیقی اپنے تحریری پیغامات کے توسط سے اس جلسہ کا حصہ رہے۔

بزم صائم کے تحت مشاعرہ

لکھنؤ۔بزم صائم کے تحت ایک طرحی مشاعرہ فیوچر اسکول نزد سنہری مسجد، نادان محل روڈ لکھنؤ میں مصرع طرح ''ہر ستم آپ کا بالائے ستم ہوتا ہے'' پر ہوا۔صدارت رحمت لکھنوی اور نظامت فاروق عادل نے کی۔مہمانوں کا استقبال بزم کے صدر یقین فیض آبادی نے کیا۔بطور مہمانان خصوصی عرفان بارہ بنکوی و عدیل منصوری شریک ہوئے۔پروگرام کا آغاز علیم الدین نے تلاوت کلام پاک سے کیا۔اس موقع پر رحمت لکھنوی، عرفان بارہ بنکوی، عدیل منصوری، یقین فیض آبادی، شکیل گیاوی، ضیاء تقوی، سلیم تابش، فاروق عادل، سلیم ہمدم، علیم الدین انداز، سلیم روشن، عبید ہاشمی، بیتاب لکھنوی وغیرہ نے کلام پیش کیا۔بزم کے جنرل سکریٹری سلیم تابش نے شکریہ ادا کیا۔

طالبہ نے نیٹ میں دوسری رینک حاصل کی

علی گڑھ۔علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ذاکر حسین کالج آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی میں ایم ٹیک کمپیوٹر سائنس و انجینئرنگ کی طالبہ تمکین فاطمہ نے یو جی سی نیٹ (جے آر ایف) میں اپنی پہلی ہی کوشش میں کل ہند سطح پر دوسری رینک حاصل کی۔تمکین نے بغیر کسی کوچنگ کے اپنی محنت سے یہ کامیابی حاصل کی ہے۔انھوں نے اے ایم یو سے ۲۰۲۳ء میں بی ٹیک مکمل کیا۔ان کا ایک تحقیقی مقالہ اے سی ایم کانفرنس پروسیڈنگ میں شائع ہو چکا ہے۔

بزم احساس ادب لکھنؤ کی طرحی نشست

لکھنؤ۔بزم احساس ادب لکھنؤ کی ماہانہ طرحی نشست بزم کے دفتر اودھ نگر میں ہوئی جس کی صدارت رفعت شیدا صدیقی اور نظامت عرفان لکھنوی نے کی۔مصرع طرح تھا ''آج گزر رہا ہوں میں وقت کے امتحان سے''۔اس موقع پر رفعت شیدا صدیقی، مرزا شارق، عرفان لکھنوی، حیدر علوی، معید رہبر، بشارت لکھنوی، عقیل غازی پوری، محسن عظیم، حسنین رجولوی وغیرہ نے کلام پیش کیا۔ ❖

قارئین کے خطوط

■ مدیر محترم!

خبرنامہ اکتوبر ماہ کا خوبصورت وخوب سیرت شمارہ نظر نواز ہوا۔ ''سبب اور مذہب: ہم آہنگی یا ٹکراؤ'' بہترین علمی مضمون ہے۔ صاحب مضمون ڈاکٹر سبط حسن نقوی نے عام بول چال میں استعمال ہونے والے لفظ 'سبب' اور عام آدمی کی زندگی میں سب سے زیادہ اہمیت رکھنے والے 'مذہب' پر جس طرح علمی بحث کی ہے وہ دلچسپ بھی ہے اور معلوماتی بھی۔ یہ عام مضمون کی ڈگر سے ہٹ کر ہے اس لئے اس مضمون نے سب سے پہلے اپنی طرف توجہ مبذول کرائی۔ مضمون نگار نے لمبی بحث کے بعد دلچسپ اور بہترین نتیجہ اخذ کیا ہے۔ صاحب مضمون کیلئے دعا ہے کہ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔

احسن زیدی
کشمیری محلہ، لکھنؤ

■ مدیر محترم!

خبرنامہ کا اکتوبر ۲۰۲۴ء کا شمارہ موصول ہوا۔ اتنا عمدہ رسالہ ہم تک پہنچانے کے لئے بہت شکریہ۔ اس شمارہ میں شامل مضامین جنگ آزادی کا نقیب: پریم چند، مہجری ادب کا لکھنوی نمائندہ: عارف نقوی، سبب اور مذہب: ہم آہنگی یا ٹکراؤ، تقسیم وطن کے افسانے اور منٹو کے حاشیے، مشق قلم کا تجزیاتی مطالعہ کے علاوہ عابدہ خان کہکشاں، ہنر رسولپوری، شکیل گیاوی، حمیرا عالیہ، ڈاکٹر عافیہ حمید، ڈاکٹر قدسیہ انجم کی شعری نگارشات بھی خوب ہیں۔ اس کے علاوہ اس میں شامل افسانہ 'زندگی کے موڑ' پر بہت سبق آموز ہے۔ یہ آج کے دور کا المیہ ہے کہ والدین اپنے بچوں کی پرورش و پرداخت اور تعلیم وتربیت میں اپنی زندگیاں کھپا دیتے ہیں، بہت سے والدین تو اپنی بچوں کو اتنی اعلیٰ تعلیم دلاتے ہیں کہ وہ بیرون ملک نوکری کے لئے چلے جاتے ہیں۔ شروع میں لوگوں کو بہت اچھا لگتا ہے۔ وہ اپنے دوستوں میں فخریہ بیان بھی کرتے ہیں کہ ان کے بیٹے یا بیٹی امریکہ، آسٹریلیا یا یوروپ میں رہتے ہیں لیکن وہی بچے جب اپنی ذمہ داریوں میں گھر جاتے ہیں اور والدین سے دوری بتدریج ان کی عادت بن جاتی ہے جو لاپروائی میں تبدل ہوجاتی ہے اور والدین پر بڑھاپا آجاتا ہے اور وہ اپنے بچوں کی توجہ کے طلبگار ہوتے ہیں لیکن تب تک دیر ہوچکی ہوتی ہے۔ اسی طرح یہاں رہتے ہوئے بھی والدین سے بے توجہی برتنے کے واقعات کم نہیں ہیں۔ اس افسانے کے یہ جملے دل کو چوکے لگاتے ہیں: ''صبح اٹھ کر حمید علی کو اخبار پڑھنے اور چائے پینے کی عادت تھی لیکن ادھر کئی روز سے گھر میں اخبار نہیں آرہا تھا اور نہ ہی دودھ۔ ان کے سامنے کالی چائے آرہی تھی۔ جب کہ انھوں نے غریبی میں بھی اخبار اور دودھ لینا بند نہیں کیا تھا۔ انھوں نے بیوی سے پوچھا تو صادقہ بیگم آنچل سے آنکھ پونچھنے لگیں..... تبھی انور نے روکھے لہجہ میں کہا۔ ''ابا! مہنگائی روز بہ روز آسمان چھو رہی ہے، اس لیے اخبار اور دودھ والے کو منع کر دیا ہے، ایک کمائی میں یہ سب ممکن نہیں۔'' انور کی بات سن کر حمید علی خاموش ہوگئے۔''

اس طرح کے افسانے وقت کی ضرورت ہیں۔ میری طرف سے افسانہ نگار کو دلی مبارکباد۔

عالیہ اسعد روحی
اورنگ آباد، بہار

''قارئین کے خطوط''

اس کالم میں 'خبرنامہ' میں شائع نگارشات پر آپ کی آراء اور تبصروں کو ترجیحی بنیاد پر شائع کیا جائے گا۔ آپ اپنے خطوط وہاٹس ایپ نمبر 9450450484 پر بھی بھیج سکتے ہیں۔

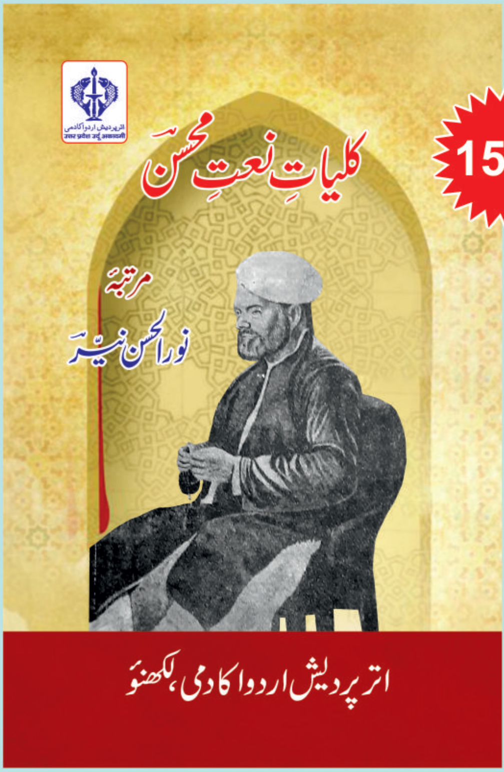
کلیاتِ نعتِ محسنؔ
مرتبہ
نورالحسن نیرؔ
اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ
150/-

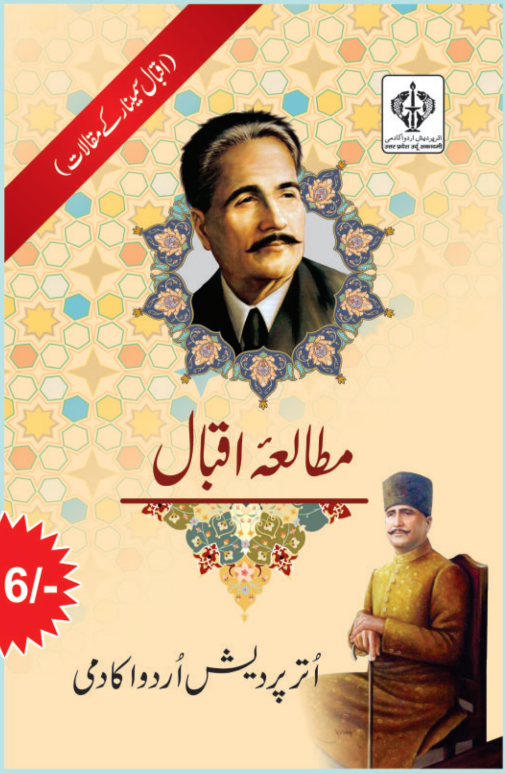
(اقبال سیمینار کے مقالات)
مطالعۂ اقبال
اُتر پردیش اُردو اکادمی
116/-

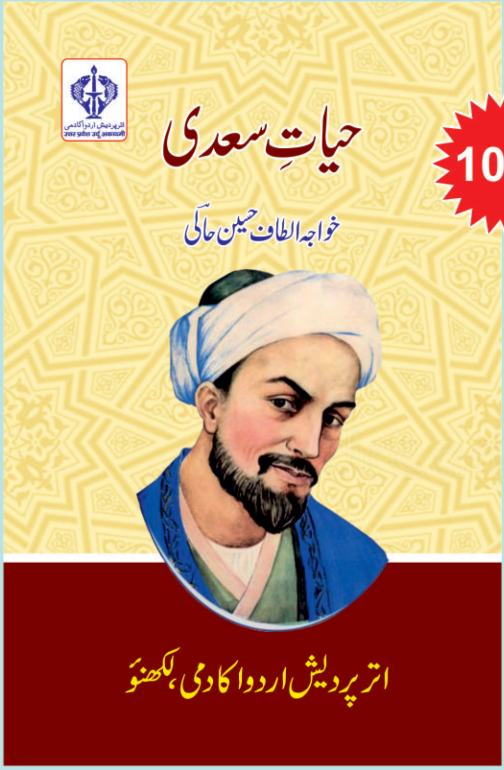
حیاتِ سعدی
خواجہ الطاف حسین حالیؔ
اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ
100/-

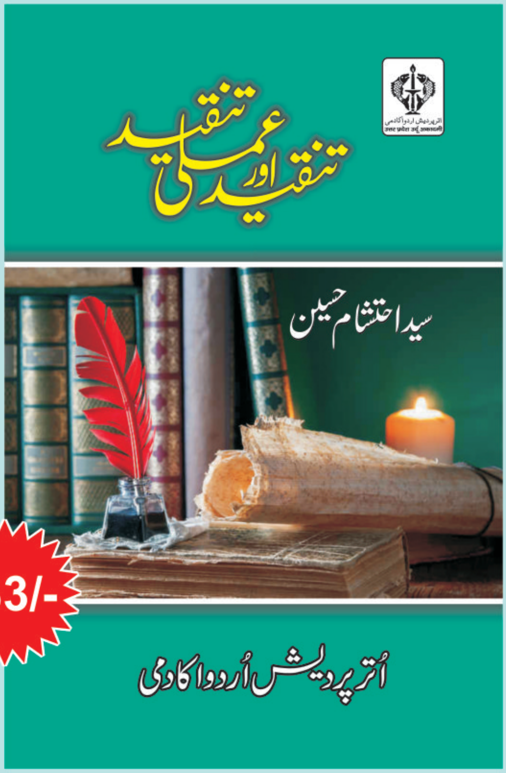
تنقید اور عملی تنقید
سید احتشام حسین
اُتر پردیش اُردو اکادمی
183/-

U.P. Urdu Akademi
Khabarnama
उ.प्र. उर्दू अकादमी ख़बरनामा
اُتر پردیش اُردو اکادمی خبر نامہ
Vol. No. 53 November 2024 Issue No. 6

اتر پردیش اردو اکادمی کی اسکیمیں

اردو طلباء کو وظائف☆ اشاعت کتب☆ صوبے کے رجسٹرڈ عوامی کتب خانوں ردار المطالعوں کو مالی امداد☆ اردو ادباء کو مجموعی ادبی خدمات اور اردو کتب پر انعامات☆ مسودات کی طباعت کے لئے مالی امداد☆ مصنفین کو ماہانہ مالی امداد☆ اردو کتابت اسکول☆ اردو کوچنگ سینٹر☆ اردو کمپیوٹر سینٹر☆ اردو کی مطبوعات کی فروخت☆ سہ ماہی ''اکادمی'' اور ماہنامہ ''خبر نامہ'' کی اشاعت☆ سیمینار سمپوزیم اور مشاعروں کا انعقاد☆ اقلیتی طلباء کو ''سول سروسیز کی تیاری کے لئے اردو آئی-اے-ایس-اسٹڈی سینٹر'' اور ماس کمیونیکیشن اینڈ میڈیا سینٹر۔

یونیورسٹی سطح کی نصابی کتابیں

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف	قیمت	نمبر شمار	نام کتاب	مصنف	قیمت
1-	ادب پارے (نثر)	سید احتشام حسین	45/=	10-	انتخاب منظومات (حصہ دوم)	مجلس مشاورت	55/=
2-	ادب پارے (نظم)	سید احتشام حسین	45/=	11-	'' نثر (حصہ اول)	مجلس مشاورت	62/=
3-	انارکلی	امتیاز علی تاج	43/=	12-	'' نثر (حصہ دوم)	مجلس مشاورت	78/=
4-	انتخاب افسانہ	مجلس مشاورت	134/=	13-	بکٹ کہانی	نور الحسن ہاشمی	45/=
5-	'' خطوط غالب	مجلس مشاورت	28/=	14-	لازمی نصاب	حکم چند نیر	46/=
6-	'' غبار خاطر	ابوالکلام آزاد	70/=	15-	معیاری نثر و نظم	حامد ندیم	73/=
7-	'' قصائد	مجلس مشاورت	64/=	16-	منتخب غزلیں	مجلس مشاورت	135/=
8-	'' مراثی	مجلس مشاورت	120/=	17-	منتخب نظمیں	مجلس مشاورت	60/=
9-	'' منظومات (حصہ اول)	مجلس مشاورت	54/=				

شخصیات سیریز

نمبر شمار	نام کتاب	مرتب	قیمت	نمبر شمار	نام کتاب	مرتب	قیمت
1-	ملک زادہ منظور احمد	انور جلال پوری	438/=	10-	سالک لکھنوی	پروفیسر مظفر حنفی	216/=
2-	ندا فاضلی	پروفیسر علی احمد فاطمی	278/=	11-	متین طارق باغپتی	ڈاکٹر ذکی طارق	216/=
3-	کلیم عاجز	ررمناظر عاشق ہرگانوی	288/=	12-	پروفیسر قمر رئیس	پروفیسر توقیر احمد خاں	245/=
4-	زبیر رضوی	ڈاکٹر مہتاب امروہوی	262/=	13-	ڈاکٹر اسعد بدایونی	حسیب سوز	245/=
5-	نشتر خانقاہی	اسد رضا	260/=	14-	حفیظ میرٹھی	ڈاکٹر تابش مہدی	245/=
6-	ساغر خیامی	ناشر نقوی	215/=	15-	عابد سہیل	ڈاکٹر صبیحہ انور	245/=
7-	مظہر امام	امام اعظم	208/=	16-	جوگیندر پال	ڈاکٹر اسلم جمشید پوری	287/=
8-	سید حامد	ڈاکٹر عبید اقبال عاصم	233/=	17-	معراج فیض آبادی	ڈاکٹر کلیم قیصر	245/=
9-	پیغام آفاقی	خان محمد آصف	224/=				

اکادمی کی مطبوعات کی خریداری و دیگر تفصیلات کے لئے رابطہ کریں
سکریٹری، اتر پردیش اردو اکادمی، وبھوتی کھنڈ، گومتی نگر، لکھنؤ-226010
سیلس ڈپو-موبائل نمبر 7081007078
Website:www.upurduakdemi.org E-mail:upurduakademi3@gmail.com